

باز

کنشیاں کی آیتیں

ۛ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
شاعر نے یہ صرع شاید کنہیا لال کپور کے متعلق ہی کہا تھا۔
کنہیا لال کپور سے ہر چیز پناہ مانگتی ہے حتیٰ کہ اس کی اپنی ذات بھی اپنے ایک
مضمون میں اس نے اس سیرجی سے اپنا مضحکہ اڑایا ہے کہ اس پر پٹنے کے بجائے
لوگ اُس سے ہمدردی کرنے لگے ہیں!

کپور کا جب کوئی مضمون چھپتا ہے تو وہ ایک ناقابلِ فراموش واقعہ ہوتا ہے اسکی
جب نئی کتاب چھپتی ہے تو ہنگامے برپا ہوتے ہیں!
طنز کے نزدیک ایک قسم کی شگفتہ تنقید ہے اور طنز نگاری ایک مقدس
شغل! دب میں افادیت کا وہ پہلو دن سے ہی قائل ہے۔ اُسے کسی کی دل
آزاری یا دل شکنی مطلوب نہیں البتہ جہالت، خود غرضی اور ریاکاری کو بے
لقاب کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔

”بال و پیر“ میں کپور کے بہترین مضامین شامل ہیں! ان میں گبار کھاتر جان شیریں
آزادی کی قسم اور پیغام ایسے طنز کے شاہکار ہیں اور ”سبز باغ“ کا ٹھکڑا کاٹو،
”اگر اپنی یاد میں“ ایسے مزاحیہ مضامین بھی جنہوں نے مزاحیہ ادب میں ایک نئے
باب کا اضافہ کیا!

کپور بہت کم لکھتا ہے۔ عام طور پر جب اُس کے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو وہ خاموش
رہتا ہے لیکن جب بھی وہ مہر سکوت توڑتا ہے اپنی حلقوں میں چمکیوں کی لہریں
”بال و پیر“ سال رواں کی بہترین تصنیف ہے۔ آپ چاہتے اسے پتہ۔
کریں یا ناپسند نظر انداز کسی حالت میں نہیں کر سکتے!

سوم پرکاش پروڈیٹرز

(۱) اس مضمون کا عنوان ”اپنی یاد میں“ ہے۔ یہ مضمون اس کتاب میں شامل ہے۔

تعارف

کنسیالال کپور کو میں سنیکڑوں مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ لیکن اُن اس کے
چہرے کے وہ طلسمی نقوش جو ذہن کی پوری گرفت میں کبھی آتے ہی نہیں۔
طلسمی سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس چہرے میں کوئی جادو ہے۔ کوئی
افسوس ہے بلکہ یہ کہ کپور کے نقش دیکھنے والے کے لئے ایک بڑی مصیبت بن
جاتے ہیں۔ یہ نقوش کچھ قابل اعتراض حد تک مدہم بھی نہیں۔ قابل فخر حد تک
تیز بھی نہیں۔ یوں سمجھئے کہ تیکھے پن اور دھیمے پن کو اگر ملاحظہ کیا جائے۔
اور پھر کوشش کی جائے کہ کپور کے رخسار کپور کی آنکھیں کپور کی ناک
اس کے ہونٹ اس کی ٹھوڈی ذرا واضح اور روشن شکل میں سامنے آجائیں
تو اکثر ناکامی ہوگی۔ ناک کے پورے نقشے کو پکڑتے پکڑتے یوں محسوس ہوتا
ہے جیسے یہ ناک نہیں ہے رخسار ہے۔ اور پھر رخسار کی طرف نگاہ دوڑائی
جائے تو وہاں آنکھ کا سا عالم طاری دکھائی دیتا ہے۔ اسی لئے

پیغام

بات یہ تھی۔ کہ رسالہ ”ڈنگ ڈانگ بھٹی“ کے سالنامے کے لئے
 مضمون یا پیغام بھیجنے کا سب ویروں نے وعدہ کیا تھا لیکن بار بار
 یاد دلانے کے باوجود ان میں سے کسی نے مضمون بھیجا نہ پیغام۔ بیچارا ایڈیٹر
 عجیب مصیبت میں مبتلا تھا۔ سالنامے کی تاریخ نزدیک آ رہی تھی۔
 اور اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ کہ وہ قارئین کو کیا منہ دکھائے گا۔ اس
 نے وزراء کو خطوط لکھے۔ تار بھجوائے۔ ٹیلیفون پر درخواست کی۔ لیکن
 اسے ہر بار یہی کہا گیا۔ کہ پہلی فرصت میں مضمون یا پیغام بھجوا دیا جائیگا۔
 آخر یہ سوچ کر کہ خدا جانے وزراء کو پہلی فرصت نصیب بھی ہوگی یا نہیں
 اس نے اسسٹنٹ ایڈیٹر کو راجدھانی میں بھیجا کہ خود جا کر پتہ چلائے کہ
 معاملہ کیا ہے ؟

اسسٹنٹ ایڈیٹر نے سب سے پہلے ”یوجنا وزیر“ سے ملاقات کرنے کی کوشش کی۔ وہ متواتر چار دن ”یوجنا وزیر“ کے دفتر میں حاضر ہوتا رہا۔ لیکن ہر روز وزیر موصوف کے پرائیویٹ سیکرٹری نے اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ کہ ”یوجنا وزیر صاحب“ کو ایک منٹ کی فرصت نہیں۔ خوش قسمتی سے پانچویں دن ”وزیر یوجنا“ کو پانچ منٹ کی فرصت تھی۔ اور ایڈیٹر نے اسے غنیمت سمجھتے ہوئے ملاقات کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔

وزیر یوجنا نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”میں آپ کو چار منٹ تاوان سیکڑے دے سکتا ہوں۔ جلدی سے کہہ ڈالئے۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟“
 ایڈیٹر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”ڈنگ ڈانگ کے لئے.....“
 ”ہاں ہاں میں نے مضمون کا وعدہ کیا تھا“

”اگر آپ نے لکھ لیا ہو۔ تو عنایت.....“
 ”آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے اور کوئی کام نہیں۔“ وزیر یوجنا نے کافی تلخی سے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ کا خیال ہے کہ مجھے اتنی فرصت ہے۔ کہ فضول رسائل کے لئے فضول مضامین لکھتا رہوں۔“

”مضمون نہیں تو پیغام ہی سہی۔“ ایڈیٹر نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

”پیغام کے لئے بھی فرصت کہاں ہے۔ دن رات یوجنا میں سوچ سوچ کر دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس میں سکت ہی کیا رہ جاتی ہے کہ کوئی اور چیز سوچ سکے۔“

”مختصر سا پیغام ہی عنایت فرمائیے۔“

”مختصر سا پیغام؟ میرے پاس کہنے کے لئے ایک لفظ تک نہیں دراصل آپ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ایک نئی یوجنا سوچنے کے لئے کتنی دماغ سوڑی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابھی آپ کے آنے سے پہلے میں سوچ رہا تھا کہ برف میں سے ویسی صابن تیار کرنے کی یوجنا بنائی جائے تاکہ غریب لوگوں کو ویسی صابن سستے داموں مہیا کیا جاسکے۔ اس یوجنا پر پانچ کروڑ روپیہ صرف ہوگا۔ اڑھائی کروڑ کی تو امریکہ سے شیشری ہی آئے گی۔ ماہرین پر جو خرچ آئے گا وہ الگ۔ بیس سال کے بعد اس یوجنا کی بدولت ویسی صابن ڈیڑھ آنہ فی من کے حساب سے مل سکے گا۔ غور کیجئے کہ عوام کو اس یوجنا سے کتنا فائدہ ہوگا۔“

”مگر برف سے ویسی صابن ———؟“

”کیسے تیار ہو سکتا ہے ———؟ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں ———

چھوڑیئے اسے سمجھنا آپ کے بس کا روگ نہیں۔ آپ ان ٹیکنیکل باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ آپ کیا میرے علاوہ بہت کم لوگ انہیں سمجھ سکتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں میں نے ایک یوجنا کا اعلان کیا تھا کہ عنقریب سورج کی بنفشی کرنوں سے شربت منبضہ تیار کیا جائیگا۔ اس اعلان پر

چند نا سمجھ ایڈیٹروں نے اخباروں میں بہت شور مچایا۔ ان کے خیال میں یہ بات ناممکنات سے بھٹی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اس یو جنا پر پینتیس کروڑ روپیہ صرف کیا جائے۔ تو پچاس سال کے اندر اسی لاکھ گنین شربت بنفسہ تیار ہو سکتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ملک کو شربت بنفسہ کی کتنی ضرورت ہے!

اگر پیغام بھی نہیں تو نئی یو جناؤں کے بارے میں اپنے ارشادات

“.....”

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ آپ میرے پرائیویٹ سکرٹری سے ایک مفلٹ جس کا نام ہے ”لچپ یو جناش“ لے جائیے۔ یہ باتصویر ہے اور آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ اگر آپ چاہیں۔ تو تصویروں کے بلاک بھی آپ کو استعمال کرنے کے لئے دئے جاسکتے ہیں۔ اس مفلٹ میں جتنی بھی یو جناؤں کا ذکر ہے سب عجیب و غریب ہیں۔ مثال کے طور پر ایک یو جنا ہے

”کو کو سے کوئین تیار کرنا“

بہت ہی دلچپ یو جنا ہے، یہ ایک اور یو جنا ہے۔
نمک سے گندھک کا تیزاب بنانا۔ ایک یو جنا سورج مجھی کے پھوٹوں سے ربڑ تیار کرنے کے متعلق ہے۔ ایک اور عجیب و غریب یو جنا لیکن معاف کیجئے۔ آپ کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے آپ کو تفصیل سے آگاہ نہیں کر سکتا۔ آپ مفلٹ میں پڑھ لیجئے گا۔

— خداحافظ —

ایڈیٹر نے وزیر موصوف کا شکریہ ادا کیا۔ اُن کے پرائیویٹ سکریٹری سے پمفلٹ کی ایک کاپی لی۔ اور ”وزیر جلوس“ کے دفتر کا رخ کیا۔

”وزیر جلوس“ اپنے دفتر میں نہیں تھے۔ وہ اپنی کوٹھی پر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے پلنگ پر دراز تھے۔ ان کے پرائیویٹ سکریٹری سے پتہ چلا کہ وہ ابھی ابھی ایک نو میل لمبے جلوس سے واپس آئے ہیں اور ان کی کمر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ پندرہ منٹ آرام کرنے کے بعد ان کا ایک اور جلوس نکالا جائے گا۔ جو پندرہ میل لمبا ہوگا۔ اگر اُن کی کمر دوہری ہونے سے بچ گئی۔ تو ہاتھی پر سوار کر کے بیس میل لمبا جلوس نکالا جائے گا۔

ایڈیٹر نے حیران ہو کر کہا —

اتنا لمبا جلوس! — اگر وزیر جلوس عوام پر نہیں تو کم از کم اپنی کمر پر ہی رحم فرمائیں۔ ورنہ ایک دن.....“

”ان کی کمر ٹوٹ جائے گی — آپ کا یہ مطلب ہے؟ پرائیویٹ سکریٹری نے مسکرا کر کہا — ”کوئی پروا نہیں۔ اُن کی کمر قوم کا بہترین سرمایہ ہے۔ لیکن وزیر جلوس نے اپنے جسم کا ہر عضو قوم کے لئے وقف کر دیا ہے۔ وہ نہیں چاہتے۔ کہ کوئی شخص ان کے درشن سے محروم رہ جائے۔ آپ نے شاید اخبارات میں پڑھ لیا ہوگا کہ اگلے مہینے ملک کے مختلف شہروں میں ان کے ایک سو پینتیس جلوس نکالے جائیں گے۔“

چراغ بجی میں پانچ۔ پونامیں پندرہ۔ بنارس میں بیس۔ مدراس میں پچاس
اور مشن میں پچپن.....“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ آئندہ ماہ بھی وہ ڈنگ ڈانگ کے
لئے کچھ نہیں لکھ سکیں گے۔“

”آئندہ چھوڑ آئندہ سے آئندہ ماہ بھی وہ لکھنے کے قابل نہ ہونگے۔
ان جلوسوں کی تھکاوٹ سے ان کی کمر کی جو حالت ہو جائے گی۔ اس
کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جو کمر کے دائمی درد میں مبتلا ہیں۔
میرا تو خیال ہے۔ کہ ان جلوسوں کے اختتام پر انہیں کم از کم تین ماہ
کے لئے کسی نرسنگ ہوم میں آرام کرنا پڑے گا۔“
”مگر وہ اتنے جلوس کس لئے نکلاواتے ہیں؟“ ایڈیٹر نے غیر معمولی
جرات سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”ان کا خیال ہے کہ ان کا درشن کر کے بہت سے لوگوں کو ذہنی تسکین
ہوتی ہے جس کا احساس ان کی اپنی ذہنی تسکین کو تقویت پہنچاتا ہے۔
ایڈیٹر نے پرائیویٹ سکریٹری سے رخصت پٹا ہی۔ دو ایک دن
بعد وہ ”وزیر تقریر“ سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وزیر تقریر نے
شکایت کی۔ کہ ”ڈنگ ڈانگ بھئی“ ان کی تقاریر چھاپنے کی بجائے ان کا
مختصر سا خلاصہ چھاپ دیتا ہے۔ ایڈیٹر نے عرض کی کہ وزیر تقریر کی تقاریر
اتنی طویل ہوتی ہیں کہ اگر انہیں شائع کیا جائے۔ تو شاید ان کے سوا کوئی
دوسری چیز چھپ ہی نہ سکے۔ مثال کے طور پر اس نے وزیر موصوف کی

تقریر بعنوان ”آخر وٹ کے فوائد“ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا — کہ وہ دو لاکھ پچاس ہزار الفاظ پر مشتمل تھی۔ حالانکہ اس میں صرف ایک بات بار بار دہرائی گئی تھی۔ کہ ”جو قومیں آخر وٹ نہیں کھاتیں وہ بہت جلد تباہ ہو جاتی ہیں“۔ وزیر تقریر نے ایڈیٹر کو مطلع کیا کہ انہوں نے یہ بات دیدہ و دانستہ دہرائی تھی۔ کہ قوم کو ذہن نشین ہو جائے۔ ایڈیٹر نے حرف مطلب زبان پر لانے ہوئے مضمون کے لئے درخواست کی۔ مضمون کا نام سنتے ہی وزیر تقریر نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا — آہ! مضمون! کاش مجھے تقریروں سے فرصت ملتی اور میں مضمون لکھ سکتا۔“

”لیکن آپ نے وعدہ کیا تھا —“ ایڈیٹر نے آزمودہ حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا —

”وعدہ! وعدے تو خدا جلنے لگتے کئے تھے۔ آپ کو یاد ہو گا انیس سو بتیس میں میں نے جمنہ کے کنارے وعدہ کیا تھا۔ کہ جب ملک آزاد ہو جائے گا۔ تو تحریر اور تقریر پر کوئی پہرہ نہیں بٹھایا جائے گا۔ لیکن آج یہ حالت ہے۔ کہ میرے سوا.....“

”کسی اور کو آزادی تحریر و تقریر حاصل نہیں۔“

”بالکل —“ انیس سو چالیس میں میں نے کہا تھا کہ جب ملک آزاد ہو جائے گا۔ تو کنبہ پروری کا خاتمہ کر دیا جائیگا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میں نے خود اپنے خاندان کے کتنے نااہل افراد.....“

”بجائے۔ لیکن قسم توڑنے کے لئے ایک آدھ وعدہ تو پورا کیجئے۔ بس ایک چھوٹا سا مضمون.....“

”کاش میرے پاس اس کے لئے وقت ہوتا۔ دراصل جب سے ملک آزاد ہوا ہے تقریر کرنے کا کچھ ایسا چمکہ پڑ گیا ہے۔ کہ موقعہ محل دیکھے بغیر تقریر کر ڈالتا ہوں۔ ابھی کل ایک اخبار کے نمائندے نے حساب لگایا کہ اگست مہینہ ایس سے لے کر آج تک جتنی تقریریں میں نے کی ہیں اگر انہیں کتابی صورت میں چھاپا جائے۔ تو اس سے پچاس انسائیکلو پیڈیا تیار ہو سکتی ہیں۔“

”میرے خیال میں نمائندے نے مبالغہ سے کام نہیں لیا۔“
 ”بالکل نہیں۔ خاص کر جب اس امر کو مد نظر رکھا جائے کہ ان میں وہ تقریریں بھی شامل ہیں جنہیں سامعین نے سننے سے انکار کر دیا۔“
 ”آپ تقریر باڑی سے تو بہ کیوں نہیں کرتے؟“
 ”کہہ نا چاہتا ہوں۔ لیکن کر نہیں سکتا۔ تقریر کم نخت بھی شراب

کی طرح ہے۔ یعنی ہے

چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافرنگی ہوئی“
 ”مضمون نہیں تو ڈنگ ڈانگ“ کے لئے پیغام ہی عطا فرمائیے۔“
 ”پیغام؟ میرے پاس کوئی نیا پیغام نہیں۔ وہی جانا پہچانا پیغام ہے۔ جو میں سینکڑوں بار قوم کو دے چکا ہوں۔“
 ”یعنی —؟“

”یعنی اپنے محبوب ”وزیرِ تقریر“ کی تقریریں سنئے۔ تقریریں پڑھئے۔ تقریریں کھائیئے۔ تقریریں پہنئے۔ تقاریر میں رہائش اختیار کیجئے۔ اور تقریروں میں اپنی نجات ڈھونڈئیئے۔“

ایڈیٹر یہ پیغام حاصل کر کے خوشی سے پھولانہ سمایا۔ اس نے باقی وزراء سے ملنے کا خیال ترک کر دیا۔ ”ڈنگ ڈانگ“ کے سالنامے میں اس نے یہ پیغام اس فخریہ نوٹ کے ساتھ شائع کیا —
 ”کہاں ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سیاسی نڈبر کا دیوالہ پٹ چمکا ہے۔ مندرجہ ذیل پیغام ان لوگوں کی نہ صرف قلعی کھول کر رکھ دے گا۔ بلکہ انہیں سوچے پر مجبور کر دے گا کہ آیا ان کا دماغی توازن قائم بھی ہے یا نہیں۔“

اَلْمَ عِلْم

یعنی دو عجیب و غریب مسخرے

عجیب مسخرے ہیں یہ ”اَلْمَ اور ”عِلْم“ بھی! جس وقت مضمون لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں یہ دونوں میرے مکان کے سامنے گلی میں آکر لڑنے لگتے ہیں اور پھر لڑتے وقت اتنا شور مچاتے ہیں کہ خیالات کا سلسلہ ایک دم منتشر ہو جاتا ہے۔ لیجئے میں نے مشکل سے پہلا فقرہ لکھا —
ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات خوشگوار ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ
..... بشرطیکہ بشرطیکہ

کہ وہ آگئے۔ آتے ہی انہوں نے جنگ کا اعلان کر دیا۔
”اَلْمَ۔“ اے چپٹ دکھاتا ہے؟ تیری یہ جرات!“

تو میں اپنی مجبوری اور بے چارگی کا اظہار کر رہا ہوں۔ کہ اس شخص کے
 صحیح ترین نقش کا مکمل تصور کرنا اور ان سے کوئی صاف تصویر بنا سکتا
 انتہائی مشکل ہے۔

وہ لے اگر عام فہم انداز میں کہا جائے تو ایک منٹ میں سے چہرے
 پر لمبی سی ناگ دکھائی دیتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں جن کو عینک
 کے بڑے بڑے شیشوں نے بُری طرح چھپا رکھا ہے۔
 یہ شیشے اکثر دبشتر لیڈی کٹ کے ہوتے ہیں جس سے شاید کپور
 اپنے چہرے کو نسائیت کا دھوکا دینا چاہتا ہے۔

ہڈیوں بھرے پچکے ہوئے گال۔ لیکن بھری پیشانی چہرے کی نسبت
 سے کان بڑے بڑے — گویا تمام چیزیں ایسی جن میں ٹھٹھک کر
 کھڑا کر دینے والی یا لمحہ بھر کے لئے ہی مہوت بنا دینے والی کوئی کیفیت دکھائی
 ہی نہیں دیتی۔ استاد زمانہ کی ٹھوکروں کے نشانات کا احساس چہرے کے
 ہر سام سے چھوٹا پڑتا ہے اور ان بولتے ہوئے مساموں کو دیکھ کر میں
 اکثر سوچا کرتا ہوں کہ ہاں! ایسا شخص ہی طنز نگار بن سکتا ہے۔ یہ دیکھی
 اور الم رسیدہ مسامات۔ زیر لب تبسم یا گل بدامن مسکراہٹیں تو بکھرتے
 سے رہے۔ ان سے تو قہقہہ ہی پھوٹ سکتا ہے۔ زہریلا قہقہہ جس کی
 تلخی میں ایک بھر پور وار ہو۔ جس کی لہریں گرد و پیش سے ٹکرائیں اور
 ہر آدمی کو کپکپادیں۔

بادی النظر میں کپور کو دور سے دیکھئے۔ یاد دور ہی سے کیوں بچا ہے

”علم۔ آنکھیں دکھائے گا۔ تو چپ نہیں دکھاؤنگا مجھے بے غیرت سمجھا ہے کیا؟“

”آلم۔ تو لگا چپت!“
 ”علم۔ پہلے تو لگا!“

”آلم۔ میں تیری طرح بدناس نہیں ہوں۔ سریپ (شریف) ہوں۔ سریپوں کی اولاد ہوں۔ میں پہلے بھی چپت نہیں لگاتا۔“

”علم۔ جابا بڑا آیا سریپ! آنکھیں کیوں دکھاتے پھر؟“

”آلم۔ میں جھگڑا نہیں چاہتا۔ لیکن صلح بھی نہیں چاہتا۔“

”علم۔ جھگڑا میں بھی نہیں چاہتا۔ لیکن جھگڑے سے ڈرتا بھی نہیں۔“
 ”آلم۔ جھگڑا کرے گا تو دانت توڑ دوں گا۔“

”علم۔ ابے جابا بڑا آیا سورما۔ جانتا ہوں کتنا بہادر ہے تو۔“

”آلم۔ تو پھر ڈرتا کیوں ہے؟“

”علم۔ میں ڈرتا ہوں یا تو؟“

”آلم۔ بڑا طرم خال بنا پھر تلے۔ مفت میں پٹ جائیگا۔“

”علم۔ چپت لگایا۔ تو انگلیاں توڑ دوں گا۔“

”آلم۔ اچھا یہ بات ہے۔ تو آ جا پھر۔ کر لے دو ماتھ!“

”علم۔ پہل تو کر پھر دیکھ کیا مجا چکھاتا ہوں۔“

”آلم۔ پہل تو کیوں نہیں کرتا۔“

”علم۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

اَلَمْ - ”میں پہل نہیں کرونگا۔“
 عِلْم - ”سریپ ہوتا تو جھگڑے کی بات ہی کیوں کرتا۔“
 اَلَمْ - ”جھگڑا میں کرتا ہوں یا تو؟“
 عِلْم - ”تو۔“

اَلَمْ - ”جھوٹ! میں جھگڑا کبھی نہیں کرتا۔“
 عِلْم - ”ارے تو تو ہے ہی بزدل۔ تو کیا کرے گا جھگڑا۔“
 اَلَمْ - ”کم تو بھی نہیں۔“

عِلْم - ”ابے چپ ہو جا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ تو مار ڈالونگا۔“
 اَلَمْ - ”اور مجھے غصہ آ گیا تو خون پی جاؤنگا۔“
 عِلْم - ”میں سریپ نہ ہوتا۔ تو تجھے جان سے مار ڈالتا۔“

اَلَمْ - ”تو سریپ! ارے سکل تو دیکھ آئیے میں۔“

عِلْم - ”بد ماسوں کو سب بد ماس ہی نظر آتے ہیں۔“

اَلَمْ - ”ابے تو کیا جانے سات نشت سے سریپ چلا آریا ہوں۔“

عِلْم - ”اور میں چودہ نشت سے سریپ ہوں۔ آئیے کچھ کھیال سریپ میں؟“

اَلَمْ - ”ارے تو اور سریپ ہی ہی ہی۔“

عِلْم - ”ارے واہ رے میرے چاند! ہو ہو ہو۔“

اَلَمْ - ”ارے بھئی تم دونوں سریپ ہو۔“ میں اپنے کمرے سے پکار کر کہتا

ہوں۔ ”اب خدا کے لئے یہ جھگڑا بند کرو۔ اور مجھے کام کرنے دو۔“ وہ

چلے جاتے ہیں۔ میں فترہ مکمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ — بشرطیکہ

بشرطیکہ ؟ عجیب بات ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ فقرہ مکمل کیسے کیا جائے۔ طبع کی روانی رکی بھی تو کہاں ! ”بشرطیکہ وہ بشرطیکہ دونوں ممالک بشرطیکہ یہ دونوں عظیم ہاں ہاں۔ بشرطیکہ وہ“ تو وہ پھر آگئے اور شور مچانے لگے۔

”اَلَمْ“ میں کہتا ہوں باغیچہ میرا ہے۔“

”عَلَمْ“ کون کہتا ہے تیرا ہے ؟“

”اَلَمْ“ میں کہتا ہوں۔“

”عَلَمْ“ تیرے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں میرا ہے !“

”اَلَمْ“ تیرے باپ کا ہے کیا ؟“

”عَلَمْ“ میرے باپ کا نہیں تو تیرے باپ کا بھی نہیں۔“

”اَلَمْ“ تمہارا اس پر کوئی حق نہیں !“

”عَلَمْ“ اور تمہارا کیا حق ہے ؟“

”اَلَمْ“ میرے کھیت کے نزدیک ہے۔“

”عَلَمْ“ میرے کھیت سے بھی دور نہیں۔“

”اَلَمْ“ لیکن باغیچے کا ماں مجھے چاہتا ہے۔“

”عَلَمْ“ وہ میرا بھی دوست ہے۔“

”اَلَمْ“ بالکل غلط۔ وہ تیرا دوست ہرگز نہیں۔“

”عَلَمْ“ میرا دوست نہیں تو تیرا بھی نہیں۔“

”اَلَمْ“ دوست ہونا ہو باغیچہ میرا ہے۔ میں نے کے رہونگا۔“

علم۔ ”ارے ”میرا میرا“ چلائے جا رہا ہے۔ کوئی ثبوت بھی ہے تیرے

پاس؟

الم۔ ”ثبوت کیوں نہیں۔ باغیچے میں گلاب کے پودے ہیں!“
علم۔ ”یہ کوئی ثبوت نہیں“

الم۔ ”میرے کھیت میں بھی گلاب اُگتا ہے۔“

علم۔ ”تو جس باغیچے میں گلاب اُگے وہ تیرا ہے؟“

الم۔ ”سب باغیچے نہیں۔ صرف ایک باغیچہ!“

علم۔ ”ارے واہ! یہ خوب دلیل ہے۔“

الم۔ ”دلیل کیوں نہیں۔ تمہارا باغیچہ پر کوئی حق نہیں“

علم۔ ”حق کیوں نہیں۔ مالی سے پوچھ کر تو دیکھ“

الم۔ ”تو پوچھ لے مالی سے۔“

علم۔ ”میں کیوں پوچھوں تو پوچھ۔“

الم۔ ”میں کیوں پوچھوں۔ اگر اس نے مجھے جواب دے دیا تو؟“

علم۔ ”اور مجھے جواب دے دیا تو؟“

الم۔ ”مجھے لیتا ہے کہ وہ مجھے جواب نہیں دے گا۔“

علم۔ ”تو پھر پوچھ کیوں نہیں لیتا؟“

الم۔ ”ارے واہ! میں کیوں پوچھوں؟“

علم۔ ”تو نہیں پوچھتا تو میں کیوں پوچھوں؟“

الم۔ ”میں باغیچہ لے کر رہوں گا۔ کلن کھول کر سن لے۔“

علم - ”دیکھو نگا تو کیسے لیتا ہے؟“
 الم - ”دیکھو نگا تو کیسے نہیں لینے دیتا؟“
 علم - ”دیکھ لینا وقت آنے دے“
 الم - ”وقت تو آگیا ہے۔“
 علم - ”تو پھر کرے دو دو ہاتھ!“
 الم - ”میں تیار ہوں۔“
 علم - ”میں تم سے بھی زیادہ تیار ہوں۔“
 الم - ”اچھا تو کر پہل۔“
 علم - ”پہل تو کر!“
 الم - ”نہیں تو کر!“
 علم - ”نہیں تو کر!“

ایک بار میں پھر پکار کر کہتا ہوں - ”بھٹی! بند کرو یہ بحث - کیسا
 باغیچہ اور کہاں کا باغیچہ - اگر دونوں اس بات سے ڈرتے ہو کہ مالی صاف
 جواب دے دیگا - تو باغیچے کو اس کے حال پر چھوڑ دو - اور اپنے اپنے
 کھیت پر شاگرد ہو - یوں ہی لڑ لڑ کر کیوں پریشان ہو رہے ہو؟ وہ
 دونوں بڑبڑاتے ہوئے ایک طرف کو چلے جاتے ہیں - میں سوچتا ہوں -
 ابھی مضمون کا پہلا فقرہ مکمل نہیں ہوا - یہ مضمون کب لکھا جائے گا -
 ”بشرطیکہ دونوں ممالک فیصلہ کر لیں - فیصلہ کر لیں - کیا فیصلہ کر لیں؟
 ستیاناس ہو الم اور علم کا - کچھ سمجھ میں نہیں آتا - کہ ہندوستان اور

پاکستان کیا فیصلہ کر لیں۔ ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ فیصلہ کر لیں کہ..... کہ..... کہ..... ”بیچے وہ کم نجات پھر آگئے۔“

آلم۔ ”رذیل کہیں کا۔ شرم نہیں آتی؟“

علم۔ ”کمینہ۔ چلو بھر پانی میں ڈوب نہیں مڑتا۔“

آلم۔ ”رذیل نہیں تو اور کیا ہے؟“

علم۔ ”میں نے کون سی رذالت دکھائی ہے؟ اے خواہ مخواہ بکواس کر

رہا ہے۔“

آلم۔ ”یہ رذالت نہیں۔ میری بہو اور بیٹی کو زبردستی اٹھائے گیا؟“

علم۔ ”اور تو نے جو میری بہن اور بھانجی کو زبردستی گھر ڈال لیا ہے۔“

وہ شرافت ہے؟“

آلم۔ ”اے میری شرافت پر حملہ کرتا ہے؟ میرے نزدیک تو کسی کی بہن

بیٹی کو بُری نظر سے دیکھنا بھی گناہ ہے۔“

علم۔ ”اور میرے مذہب میں کسی پرانی عورت کو ہاتھ لگانا گناہ عظیم ہے۔“

آلم۔ ”تو پھر میری بہو اور بیٹی کو واپس کیوں نہیں کرتا؟“

علم۔ ”پہلے تو میری بہن اور بھانجی واپس کر۔ پھر اپنی بہو اور بیٹی کو

واپس لینے کا مطالبہ کرنا۔“

آلم۔ ”واہ! یہ کیا بات ہوئی؟“

علم۔ ”بات کیوں نہ ہوئی۔ کیا میری بہن اور بھانجی کی کوئی عزت

نہیں؟“

اَلَمْ - اَدْرِکِیَا میری بہو اور بیٹی کی کوئی عزت نہیں؟
 عِلْم - تو پھر سمجھوتہ کیوں نہیں کرتا؟
 اَلَمْ - تو سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتا؟
 عِلْم - میں نہیں کرنا چاہتا یا تو؟
 اَلَمْ - تو؟
 عِلْم - نہیں تو؟
 اَلَمْ - نہیں تو؟

لیجئے انہوں نے پھر میں میں تو تو لگا دی۔ اب انہیں کون سمجھائے۔
 کم نجات لڑنے سے باز ہی نہیں آتے۔ اور پھر لڑ بھی رہے ہیں کس بات
 پر! ان دونوں سے خدا سمجھے۔ میرا تو دماغ چاٹ لیا ہے دونوں نے۔
 فقرہ مکمل کیسے ہوگا۔ خیالات کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ اچھا ایک بار پھر
 کوشش کی جائے۔ ”بشرطیکہ۔ بشرطیکہ۔“ اُف کچھ بھی تو نہیں سوچتا۔
 بشرطیکہ بشرطیکہ کیا؟ ایڈیٹر صاحب آپ ہی بتائیے بشرطیکہ
 پاکستان اور ہندوستان کیا کریں کہ ان کے تعلقات خوش گوار ہو جائیں؟

اپنی یاد میں!

آج ۲۰ جون ۱۹۶۰ء کو مشہور طنز نگار کہنیا لال کپور اس دنیا سے گزر گئے۔

”خدا بچے بہت سی خامیاں بھیس مرنے والے میں۔
روحانی طور پر تو ان کی وفات اسی دن واقع ہو گئی تھی جب آج سے
تیرہ برس پہلے انہیں لاہور چھوڑنا پڑا تھا۔ لیکن جہانی طور پر وہ آج
انتقال کر گئے۔ غالباً دنیا کے وہ پہلے ادیب تھے جو پیدا ایک بار ہوئے۔
لیکن مرے دو بار بھیہ کمپنی والوں کے علاوہ شاید بہت کم لوگوں کو ان
کی موت کا افسوس ہوا ہوگا۔ دوستوں، ڈاکٹروں اور خود اپنے اندازے
کے مطابق انہوں نے بہت لمبی عمر پائی۔ اپنے خاندانی ڈاکٹر کی پیش گوئی
کے مطابق انہیں آج سے کم از کم بیس برس پہلے مرجانا چاہئے تھا۔

اُردو کے اس مشہور طنز نگار کی موت دل کے صدمے سے ہوئی۔
کل تک بالکل تندرست تھے۔ شام کو آل انڈیا ریڈیو پر انہوں نے ایک
وزیر کی تقریر سنی اور یہ تقریر سنتے ہی ان کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔ اس
تقریر کے جن لفظوں سے انہیں صدمہ پہنچا دل ج ذیل ہیں:-

”اگر یہ ذمہ دار لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔ اگر انہیں اپنی تنخواہوں میں
اضافہ ہونے کی کوئی امید نہیں۔ اگر ان کے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ سہ ماہ
امریکن پاکٹ سپرنز کی دو چار سستی کتابیں خرید سکیں۔ اگر بناسپی گھی
کھا کھا کر ان کے گلے خراب ہو گئے ہیں۔ تو انہیں پریشان ہونے کی
کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ انہیں چاہئے۔ کہ وہ زیادہ سے زیادہ ناج
اگائیں

پروفیسر کنہیا لال کپور بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک تھے، انہیں
دیکھ کر سب وقت ابراہیم لنکن، تاجدار اعظم محمد علی جناح اور آریل اسٹون
کا خیال آ جاتا تھا۔ وہ حد سے زیادہ لمبے اور دبیلے تھے۔ جب بیٹھے ہوتے
تو معلوم ہوتا کہ کھڑے ہیں۔ اور جب کھڑے ہوتے تو ایسا لگتا کہ کھڑے
نہیں ہیں بلکہ گر پڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ خدا نے انہیں ایک ایسا
چہرہ عطا فرمایا تھا جس میں مسکراہٹ جیسا کارٹونسٹ تو دلچسپی لے سکتا تھا لیکن
چختائی جیسا مصوّر دیکھ کر ناک بھول چڑھتا۔

کرشن چندر کے قول کے مطابق انہوں نے کبھی کسی سے محبت نہیں
کی۔ دنیا میں کسی نے ان کو محبت کرنے کے قابل ہی نہیں سمجھا۔ اس لحاظ

سے وہ صرف نام ہی لگے کہنیا“ تھے۔ حیرت اس بات پر نہیں کہ انہیں عمر بھر کوئی رادھا“ نہیں ملی۔ بلکہ اس پر ہے کہ انہیں کبھی کوئی ”سدا“ بھی نہیں ملا۔

جن چیزوں کے پیچھے ایک عام آدمی بھاگتا ہے۔ مثلاً عورت، دولت، قوت وغیرہ ان کا انہوں نے کبھی پیچھا نہیں کیا۔ علائکہ اگر وہ چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے۔ کیونکہ خدا نے انہیں کافی لمبی لمبی ٹانگیں دی تھیں۔ جہاں تک عادتوں کا تعلق ہے ان کی کوئی عادت مشکل ہی سے سراہی جاسکتی ہے۔ سچ کا کام کل کے بجائے ہمیشہ پرسوں کیا کرتے تھے۔ پرہیز کے مقابلے میں علاج کو بہتر سمجھتے تھے۔ کہتے تھے پرہیز تو ہر روز کرنا پڑتا ہے۔ لیکن علاج صرف ان دنوں میں کرایا جاتا ہے۔ جب آدمی بیمار ہو۔ دوستوں کے خطوط کا جواب نہیں دیتے تھے کہتے تھے جب تک خطا اتنا دلچسپ نہ ہو۔ کہ خواہ مخواہ جواب دینے کو جی چاہے، جواب نہیں دینا چاہیے۔ بہت کم لکھا کرتے تھے۔ زیادہ لکھنے سے اس لئے گھبراتے تھے کہ زیادہ لکھنے سے آدمی گنجا ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں خواجہ احمد عباس اور کرن چندر کی مثالیں دیتے تھے۔ ساتھ ہی کہتے تھے۔ کہ گنجا ہونے کی وجہ سے یہ پریشانی اٹھانا پڑتی ہے کہ دوست احباب چہرے کے بجائے ہمیشہ سر کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔

سنت اس درجہ تھے کہ اگرچہ عمر بھر سگریٹ پیتے رہے لیکن کبھی اتنی توفیق نہ ہوئی کہ ایک لیش ٹری ہی خرید لیں۔

آپ نزدیک آکر گھور گھور کر اسے دیکھتے تو ایک عام سا تہم رسید آدمی دکھائی دے گا۔ جس سے کسی خاص منفرد قسم کی ذہانت یا فراست کا پتہ نہیں چلتا اور حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص ادیب اور آرٹسٹ تو کجا کسی عام سی بات کو بھی ذرا علیحدہ اور اثر انگیز ڈھب سے بیان نہیں کر سکتا ہوگا۔ ہمارا طبقاتی نظام اپنے استبداد کی بدولت بہت کم لوگوں کو یہ اجازت دیتا ہے کہ اگر انہیں چوٹ لگے تو وہ ”اوٹی“ بھی کر سکیں۔

دباؤ اور گھٹن ہی اس نظام کے استبداد کا عام سانچہ ہوا کرتا ہے۔ دباؤ اور گھٹن کپور کے نصیب میں بھی شامل ہو جاتا۔ لیکن اس کڑے کیلچے والے آدمی نے چوٹ کے ساتھ ہی ساتھ ”اوٹی“ کا اظہار بھی سیکھ لیا۔ اس ”اوٹی“ کو جاری رکھنے کی عادت بھی پیدا کر لی۔ آوریوں دباؤ اور احتجاج کی مسلسل نبرد آزمائی نے اسے قہقہہ لگانے کا فن سکھا دیا۔ اس قہقہے میں بے ساختگی تو ہے۔ لیکن کڑوی کیلی بے ساختگی۔ اس میں زندگی تو ہے۔ لیکن چھتی چلائی زندگی۔ مسرت اور ہنسی کے پرے پر کپور کے کیچھے ہوئے نقش و نگار کی شکل دیکھ کر ایک دنیا لرز اٹھتی ہے۔ خوف سے کانپ کانپ جاتی ہے۔ اور یہی کپور کا آرٹ ہے۔ جو اس کی منفرد شخصیت کا مظہر بھی ہے۔ اور جس نے دوسری شخصیتوں کا احاطہ بھی کر رکھا ہے۔ غالب کے الفاظ میں سادگی و پُرکاری ہی اس کے کیریکٹر کا اہم عنصر ہے۔ اور سادگی و پُرکاری ہی اس کے

معمولی سے معمولی خطرے میں پڑنے سے ڈرتے تھے۔ ایک دفعہ ہوائی جہاز میں محض اس لئے سوار ہونے سے انکار کر دیا۔ کہ ”میں ادنیٰ پر سے گر کر مرنے کے بجائے چار پاٹی پر پڑے پڑے مرنا دیا وہ پسند کرتا ہوں۔“ صحت ان کی ہمیشہ خراب رہتی تھی۔ لیکن وہ اس طرف بالکل توجہ نہیں دیتے تھے۔ کہتے تھے ”صحت تو خراب ہے ہی۔ اگر اس کا افسوس کر دنگا۔ تو دماغ بھی خراب ہو جائے گا“ ان کی صحت کی فکر ان سے زیادہ ان کے دوستوں کو رہتی تھی۔

ایک بار کچھ دوست گھیر گھار کر انہیں کشمیر لے گئے۔ کشمیر کے متعلق مشہور ہے کہ اگر بھنا ہوا مرغ بھی اس سر زمین میں ہو۔ تو اس کے بال و پر دوبارہ نکل آتے ہیں۔ لیکن ان پر کشمیر کی آب و ہوا کا اثر یہ ہوا۔ کہ سر کے آدھے سے زیادہ بال جھڑ گئے۔ یعنی گنجنے ہونے سے بال بال بچے۔ اس واقعہ کے بعد انہوں نے کبھی کشمیر کا رخ نہیں کیا۔

۱۹۴۲ء میں انہوں نے ایک چونکا دینے والا مضمون ”غالب ترقی پسندوں کی مجلس میں“ لکھا اور ————— اُرڈو کی ساری ادبی دنیا میں مشہور ہو گئے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ بائرن کی طرح ایک صبح اٹھے۔ اور انہوں نے اپنے کو مشہور پایا۔ لیکن یہ ٹھیک ہے کہ انہیں مشہور ہونے کے لئے شدید انتظار نہیں کرنا پڑا۔ یہ شہرت ان کے حق میں زہر ثابت ہوئی۔ کیونکہ بہت جلد انہوں نے محنت سے لکھنا ترک کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ جس طرح شیر ٹین اپنی صرف ایک تقریر کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہیں

بھی ایک اچھے مضمون کے مصنف ہونے کی حیثیت سے دُنیا یاد رکھے۔ یوں تو انہوں نے بہت سے مضمون لکھے جو طنز و مزاح سے بھرپور ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انہیں مزاح نگار نہیں کہا جاسکتا۔ انہوں نے ہر اس چیز کا جو زمین کے اُوپر اور آسمان کے نیچے ہے مذاق اڑایا۔ ادیبوں کا۔ رہنماؤں کا۔ فلمیں بنانے والوں کا۔ فلمیں دیکھنے والوں کا۔ غلامی کا۔ آزادی کا۔ لیکن انہوں نے وکٹس یا ڈوڈاؤس کی طرح کوئی مزاحیہ کردار اُردو ادب میں نہیں چھوڑا۔ ان کے مضامین میں کسی ”مکابر“ یا ”جیوز“ کو ڈھونڈنا فضول ہے۔ اصل میں وہ مزاح نگاری سے زیادہ طنز میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ بھارت کو مزاح کی نہیں بلکہ طنز کی ضرورت ہے۔

لکھنے کو تو انہوں نے اُردو میں چار چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی ہیں جن کے نام اے۔ مشکل نہیں کہ کسی کو آسانی سے یاد نہیں رہ سکتے (یعنی سنگ خشت، شیشہ و تیشہ، چنگ و رباب، اور نوکِ نشتر) لیکن ان کتابوں میں بہت کم مضمون کام کے ہیں۔ کچھ مضمون تو اتنے مختصر ہیں۔ کہ انہیں پڑھ کر مصنف پر ترس آتا ہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں ان کے مضمون بے حد مختصر اور بے کیف ہو گئے تھے۔ ایک بار راجندر سنگھ بیلوی نے ان سے شکایت کی تھی۔ کہ آپ کی تحریر دل میں اب وہ مزاح نہیں جو پہلے ہوتا تھا۔ اس پر انہوں نے ہنس کر جواب دیا۔ کہ میں تو وہی ہوں لیکن پڑھنے والے اب پہلے سے زیادہ چالاک ہو گئے ہیں کہتے ہیں کہ مرنے سے ایک دن پہلے انہوں نے اپنے چاروں مجموعوں کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ ”میں بھی

کتنا احمق ہوں کہ میں نے یہ کتابیں لکھیں۔

یہ بات بہت افسوسناک ہے کہ وہ بڑے ادیب نہیں بن سکے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ایفون کھانے کی عادت نے کالج کی قوتِ تحریر کو تیس برس کی عمر میں تباہ کر ڈالا تھا۔ اسی طرح کالج کے نوٹس لکھنے کی عادت نے انہیں کہیں کانہ رکھا۔ انہوں نے پچاس برس کی عمر میں اتنے نوٹس لکھے کہ ان سب کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے ایک مٹری ٹرک کی ضرورت ہوگی جب ان سے پوچھا جاتا تھا کہ آپ یہ ذلیل کام کیوں کرتے ہیں۔ تو رو رو کر کہا کرتے تھے۔ ”سب پیٹ کی خاطر“ اور عجیب بات تو یہ ہے کہ اس ذلیل کام سے بھی زیادہ روپیہ نہ کما سکے۔ کیونکہ جب وہ فوت ہوئے تو ان کا بینک میں سولیس صفر تھا۔

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ اگر وہ یہ ذلیل کام نہ کرتے تو اچھے ادیب بن سکتے تھے۔ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ پروفیسری چھوڑ کر سارا وقت ادب کی خدمت میں لگا دیتے تو امر ہو جاتے۔ خود کہتے تھے کہ اگر وہ کچھ بھی نہ لکھتے۔ تو بہت اچھے رہتے۔ بہر حال ان میں سے کوئی بات بھی ٹھیک ہو ان کو ایک ایسی کلی سے نسبت دی جاسکتی ہے جو بھی چٹک کر پھول نہ ہو سکی۔ یا اس آگ سے جو بھڑک کر شعلہ نہ بن سکی وہ ایک ٹٹاٹا ہوا چراغ، ایک بجھتا ہوا شعلہ اور ایک جھلٹاتا ہوا ستارا تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جگنو کی طرح ایک آدھ بار چٹک کر وہ ہمیشہ کے لئے اندھیرے میں غایب ہو گئے۔ خدا کرے کہ ان کی روح کو کبھی سکون نہ ملے۔

بندہ پرور اکب تملک؟

بندہ پرور! یہ سگریٹ جو میں نے ابھی آپ کو پیش کیا ہے دو سال ہوئے دو پیسے میں بکتا تھا۔ پچھلے سال تین پیسے میں اور ان دنوں ایک آنے میں مل رہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ آپ نے اس کی قیمت بڑھا کر مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں آپ کی طرح ریاضی میں ماہر نہیں ہوں۔ لیکن یہ بات تو کسی معمولی ریاضی دان کی سمجھ میں بخوبی آ سکتی ہے کہ آپ نے سگریٹ کی قیمت سو فی صد بڑھا کر کم نہیں ستم کیا ہے۔ اس پر بھی آپ فرماتے ہیں۔ کہ میں اس ستم کو ستم نہ کہوں۔ اچھا آپ کی خاطر اسے کم تسلیم کر لیتا ہوں۔ کہ آپ شریف آدمی ہیں۔ میرا مطلب ہے کبھی ضرور شریف ہوا کرتے تھے۔ آپ کہتے ہیں۔ اگر سگریٹ مہنگے ہو گئے ہیں۔ تو میں بیڑی کیوں نہیں پتا۔ لیکن بندہ پرور! بیڑی بھی آج کل کو نسی سستی ہے۔ بیڑی سگریٹ کے

بھاؤ بکیتی ہے۔ سیکرٹ سگار کے بھاؤ۔ اور سگار اتنا مہنگا کہ آپ کے علاوہ بہت کم لوگ پی سکتے ہیں۔ خیر سیکرٹ اور بٹری کی بات جانے دیجئے ان کے بغیر بھی انسان زندہ رہ سکتا ہے۔ راشن کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ خدا نخواستہ کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھتے کہ راشن کے بغیر بھی آدمی زندہ رہ سکتا ہے۔ بندہ پرورہ! پچھلے ہفتے جو مجھے راشن ملا اس میں گھیوں کم اور کنکر زیادہ تھے۔ آپ یقین فرمائیے کہ گھیوں صاف کرتے وقت کئی بار سوچنا پڑا کہ اس میں سے کنکر چنے جائیں یا گھیوں۔ اگر ایسا راشن کھا کھا کر میری انٹریاں باگر فے یا دونوں بیکار ہو گئے۔ تو آپ تو یہی کہیں گے۔ کم بخت اندھا تھا۔ مٹی اور گھیوں ملا کر کھانا رہا۔ اور شاید میں تسلیم کر لوں گا۔ کہ میں واقعی اندھا تھا۔ کیونکہ آپ شریف آدمی ہوں نہ ہوں چالاک ضرور ہیں۔ راشن کی کوالتی کو چھوڑیئے اس کی کوالتی کو لیجئے۔ کسی ہفتے آپ مجھے پانچ چھٹانک دیتے ہیں اور کسی ہفتے تین چھٹانک۔ کیا آپ کا یہ تو خیال نہیں کہ ایک ہفتے مجھے بھوک زیادہ لگتی ہے اور دوسرے ہفتے کم۔ آپ کی دعا سے ابھی میرا صدمہ خراب نہیں ہوا۔ مجھے ہر ہفتے ایک جیسی بھوک لگتی ہے۔ اس لئے کم از کم جب تک میرا صدمہ بگڑتا نہیں۔ مجھے پانچ چھٹانک راشن اپنے کی عنایت کیجئے۔ اور سینے بندہ پرورہ! جب خراب راشن اور ناخالص گھی کھانے کے بعد بیمار پڑتا ہوں تو سجدہ بیماری سے اتنا ڈر نہیں لگتا۔ جتنا آپ کے ڈاکٹروں سے۔ سبحان اللہ! کیا خیراتی شفا خانے کھول رکھے ہیں آپ نے۔ گھنٹوں قطار میں کھڑا رہتا ہوں۔

لیکن باری نہیں آتی۔ ایک انار و صد بیمار والا معاملہ ہوتا ہے۔ اور پھر ہسپتال اگر بستر ملتا ہے تو دوا نہیں ملتی۔ دوا ملتی ہے تو بستر نہیں ملتا۔ ڈاکٹر بات سن لیتا ہے تو نرس پروا نہیں کرتی۔ نرس مہربان ہوتی ہے تو کمپونڈر روٹھ جاتا ہے۔ گستاخی معاف! کہیں آپ نے یہ شفا خانے آبادی کے بڑھتے ہوئے وباؤ کو کم کرنے کے لئے تو نہیں کھولے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر تو وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔

بندہ پرورد را پچھلے چند سالوں سے آپ نے اتنے ”جرمانے“ لگا ڈٹے ہیں کہ بسا اوقات سوچتا ہوں کہ آپ کا کام صرف جرمانے لگانا اور میرا کام جرمانے ادا کرنا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ میں کمانا اسی لئے ہوں کہ آپ کے لگائے ہوئے جرمانے ادا کر سکوں۔ اگر گھڑی خریدتا ہوں تو گھڑی خریدنے کا جرمانہ ادا کرتا ہوں۔ اگر قلم لیتا ہوں تو قلم خریدنے کا جرمانہ دیتا ہوں۔ گھڑی یا قلم خریدنے کے بعد جو تھوڑی بہت ”کمر“ بچ جاتی ہے۔ اسے آپ کا جرمانہ توڑ دیتا ہے۔ خون پسینہ بہا کر روپیہ کمانا ہوں۔ لیکن روپیہ کمانے کا بھی جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ چاہتے تو یہ تھا کہ آپ میری بہت اور مشقت کو سہا رہتے اور مجھے ایک آدھہ متعہ عطا فرماتے۔ لیکن آپ تو اٹکا جرمانہ طلب کرتے ہیں۔ تم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ آپ یہ جرمانے اپنے قول کے مطابق میری بہبودی کے لئے وصول کرتے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ اس میں میری بہبودی کیا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے۔ کہ آپ میری کمال اتارتے یا خون پخوڑتے چلے جائیں اور ساتھ ساتھ کہیں

کہ آپ میری بہبودی کے لئے کر رہے ہیں۔ میں آپ جیسا ذہن نہ سہی۔
لیکن اتنا کند ذہن بھی نہیں کہ آپ میری کھال اتاریں۔ مجھے تکلیف
محسوس ہو۔ اور میں اسے اپنی بہبودی سمجھوں۔

اچھا یہ بھی جلنے دیجئے۔ یہ جو آجکل آپ مجھے فلمیں دکھا رہے
ہیں ان کے متعلق کیا ارشاد ہے مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھے
دکھانے سے پہلے جب آپ خود دیکھتے ہیں۔ تو آنکھوں پر سی بانڈھ لیتے
ہیں اور کانوں میں روٹی ٹھونس لیتے ہیں۔ اسی لئے تو آپ کو غریاں سے
عرباں منظر نظر نہیں آتا۔ اور یہودہ سے یہودہ گانا سنائی نہیں دیتا۔
ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ آپ ایسی فلمیں مجھے اور میرے بچوں کو بھی نہ دکھاتے
پھر ستم یہ کہ کسی بھی اچھے ملک کی بنی ہوئی فلمیں آپ مجھے دیکھنے کی اجازت
نہیں دیتے۔ کہیں آپ کی رائے میں فلموں سے مراد محض ”سنگی پنڈلیاں“
یا ”نیم عریاں سیٹے“ تو نہیں۔ بندہ پرور کچھ سمجھ دار لوگ تو فلموں سے
بڑے بڑے کام نکالتے ہیں۔ پھر آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ نیم عریاں اعضاء
کی نمائش ہی فلموں کا سب سے بڑا افادی پہلو ہے۔ آپ کا اپنا مذاق
لاکھ لپٹ سہی۔ لیکن آپ میرا مذاق بگاڑنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ آپ
شاید کہیں گے کہ تمہارا مذاق سنوارنا میرا کام نہیں۔ یہ ادباء اور معلمین
کا ہے۔ لیکن آپ نے ادباء اور معلمین کے لئے کیا کیا ہے۔ یہی ناکہ بہترین
ادباء اور معلمین کو جیل کی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا۔ اور باقی کی تصانیف
کو نذرِ آتش کر دیا۔

یہ بھی فضول بات ہے ؟ اچھا اسے بھی رہنے دیجئے۔ خدا را یہ بتائیے
 کہ آپ مجھ سے خواہ مخواہ کیوں ڈرتے رہتے ہیں۔ میں تو ایک بے ضرر
 انسان ہوں۔ میرے پاس نہ پستول ہے نہ بم۔ پستول میں نے دوسروں
 کے پاس دیکھا ضرور ہے۔ لیکن یقین فرمائیے۔ چلایا کبھی نہیں اور بم ! بم
 کی شکل سے ہی ناواقف ہوں۔ لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ میں ہر وقت ہاتھ
 میں پستول اور بغل میں بم لئے پھرتا ہوں۔ یہ جو آپ نے نصف درجن
 خادم صرف میری نگرانی کے لئے تعینات کر رکھے ہیں۔ میرے خیال میں
 بڑے مضحکہ خیز ہیں۔ انہیں اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ سائے کی طرح
 میرے پیچھے لگے رہیں۔ سایہ تو صرف روشنی میں تعاقب کرتا ہے۔ یہ تاریکی
 میں بھی پیچھا کرنے سے باز نہیں آتے۔ اگر میں کسی ہوٹل میں چائے
 پینے جاتا ہوں تو یہ بھی وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ میں چائے کا پیالہ اٹھاتا
 ہوں۔ یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ میں پیالہ دائیں ہاتھ سے اٹھاتا ہوں یا
 بائیں ہاتھ سے۔ اگر میں فلم دیکھنے جاتا ہوں۔ تو وہ یہ دیکھنے جاتے ہیں۔
 کہ میں کونسی فلم دیکھنے گیا تھا۔ اور پھر یہ میرے متعلق عجیب و غریب
 انکشافات کرتے رہتے ہیں۔ ”آج شام کے پانچ بجے یہ خطرناک شخص
 فلاں سڑک پر کھڑا تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ سڑک کو بارود سے اڑانے کی
 ترکیب سوچ رہا تھا۔“ کل دن کے ایک بجے یہ شخص فلاں بینک میں داخل
 ہوا۔ وثوق سے کہا جاسکتا ہے۔ کہ بینک کو لوٹنا چاہتا تھا۔“ آج صبح
 کے سات بجے یہ شخص سیکرٹیریٹ کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ صاف ظاہر

ہے کہ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا تھا۔

بندہ پرور! جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا۔ میرے پاس سبتول ہے نہ جم۔ پیشہ آباؤ پشت سے نہیں ہزار پشت سے سپہ گری نہیں لے گا۔ ایک معمولی سائیکلڈ ہینڈ قلم ضرور ہے۔ اس کی نب بھی اتنی گھس چکی ہے کہ تین بار دو شنائی میں ڈبوئل تو ایک لفظ لکھتی ہے۔ پھر خواہ مخواہ میرا تعاقب کیوں کیا جا رہا ہے۔

بندہ پرور! آپ کہیں گے کہ میری سب تر کائیتیں فضول ہیں یا یہ کہ وہ جائز ہیں لیکن آپ انہیں دفع کرنے کی کوشش کریں گے۔ پانچ سال ہوئے آپ نے یہی کہا تھا آج بھی یہی کہتے ہیں۔ مجھے نہ اس وقت یقین آیا تھا نہ اب آرہا ہے۔ لیکن ان پانچ سالوں کے بعد بھی اگرچہ آپ نے ہی میں جو پہلے تھے۔ کم از کم میں یقیناً وہ نہیں ہوں جو بھی تھا۔ آپ کے پاس لاکھ خوبصورت الفاظ ہی لیکن اب آپ مجھے ان خوبصورت جھنجھنوں سے پہلانا نہیں سکتے ہیں جانتا ہوں آپ بڑے شعبہ باز ہیں لیکن اتنا تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ جب کسی شعبہ کا بھانڈا چور ہے پر چھوٹ جاتا ہے تو وہ شعبہ نہیں رہتا۔ ایک بہت بڑا مذاق بن جاتا ہے۔ آپ مجھے ہزاروں ہزار باغ دکھائیں لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ وہ باغ ہیں۔ جہاں بہار کا بھوڑے سے بھی گذر نہیں ہوتا۔ یہ نہ صرف میں نے جان لیا ہے بلکہ میرے جیسے لاکھوں انسانوں پر یہ راز کھل چکا ہے کہ آپ اور داغ دہلوی کے ”بت حیلہ جو“ میں صرف یہ فرق ہے کہ وہ خوبصورت تھا اور آپ خوبصورت نہ ہونے کے باوجود ”حیلہ جو“ ہیں۔ ان حالات میں آپ کا یہ کہنا کہ آپ ایک بار پھر مجھے فریب دینے کی کوشش کریں گے۔ کہانٹک کا راز مہو سکتا ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ علوم کو فریب یا جاسکتا ہے اور یا لگیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے بندہ پرور کہ بندہ پرور کب تک؟

سنسنی خیز

یہ ان دلوں کی بات ہے جب میں لاہور میں دھوبیوں کی بستی میں رہتا تھا۔ دھوبیوں کی بستی تو میں نے یونہی کہا۔ دراصل یہ دھوبیوں ٹائیٹوں اور کھاروں کی مشترکہ بستی تھی۔ اس چھوٹی سی بستی میں میری حیثیت صدر ٹروین کی سی تھی۔ کیونکہ اپنے سب ہمسایوں سے میں ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ ایک دن میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ کہ ایک صاحب شریف لائے۔ شکل و صورت سے شریف تو نہیں لیکن کافی مظلوم معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف کرائے بغیر مجھ سے پوچھا۔ ”کیوں صاحب! کچھ آپ کو معلوم ہے آپ کے محلے میں دھوبیوں کی دو جماعتوں میں لڑائی ہوتی ہے۔ جس میں تین دھوبی سخت زخمی ہوئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے اس لڑائی کا کوئی علم نہیں۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے دھوبیوں میں

آرٹ کا راستہ۔

چہرے کو علیحدہ کر کے دیکھئے۔ تو کپور کا باقی سارا جسم اتنا نمایاں اور
 اُبھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کہ میں بھر سے پچانا جاسکتا ہے۔ پنجابی زبان
 کی ایک مخصوص اصطلاح ”لم سلما“ سے ذہن میں جو جاذب نظر اور
 رومانٹک سی تصویری کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ کپور اس سے
 مکمل طور پر محروم ہے۔ لیکن ”لم سلما“ کا لفظ اس پر صادق خوب
 آتا ہے۔ لمے لمے بازو، لمے لمے ہاتھ، لمبی لمبی ٹانگیں جو سڈول نہیں
 ہیں۔ جن میں اگرچہ مستقیم ضرور ہے۔ مگر حین بناوٹ نہیں۔ لمبی
 لمبی پیٹھ پر ہلکا سا جھکاؤ اور کمر کے گرد مجبورانہ قسم کی حسینانہ پچکا
 چلتا ہے تو جیسے پورا جسم بل کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ناچتا ہوا معلوم
 ہوتا ہے۔ یہ پچکا اور بل ایک خاص آہنگ پیدا کرتے ہوئے دکھائی
 دیتے ہیں۔ اور ان سے اگر کسی کو یہ خطرہ پیدا ہونے لگے کہ پچکے پچکتے
 یہ جسم کہیں رستے ہی میں اچانک ٹوٹ کر آ رہے گا۔ تو یہ اس کی غلط
 فہمی ہے۔ ان لمبی لمبی ہڈیوں میں زندہ رہنے کی بے پناہ قوت ہے۔
 ان کی پچک میں موت کی دعوت نہیں۔ بلکہ زندگی کا ایک مسلمہ اور
 بے باک ڈھب پایا جاتا ہے۔ یہ پتلا پتلا جسم سنگینوں اور سختیوں کی
 آماجگاہ رہا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق کسی قسم کا عامیانہ خطرہ
 بے معنی ہے۔

اسے اپنے اس پتلے جسم کا خود بھی کافی احساس ہے۔ ایک مرتبہ

کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔“

”تو پھر شاید نائیٹوں میں لڑائی ہوئی ہوگی۔“

”مجھے اس بات کا بھی علم نہیں۔“

”شاید کہاروں میں۔۔۔۔۔“

”مجھے اس کا بھی کوئی پتہ نہیں۔“

وہ یائوس ہو کر واپس جانے لگا۔ میں نے کہا: ”لڑائی جھگڑوں میں مردوں کی بہ نسبت عورتوں کو زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ بھڑیٹے میں شرمیلی جی سے پوچھتا ہوں۔“ شرمیلی جی نے بتایا کہ ایک دھوبن اپنی ہمسائیٹ کھارن سے صبح لڑ رہی تھی۔ شاید دھوبن کے لڑکے نے کھارن کی لڑکی کو پیٹا تھا۔ یا شاید کھارن کی لڑکی نے دھوبن کے لڑکے کو۔

میں نے انہیں صورت حالات سے آگاہ کیا۔ وہ بہت اُداس لہجے میں کہنے لگے:

”کھودا پہاڑ نکل اچوٹا۔“

میں نے دریافت کیا: ”آپ اس لڑائی میں اتنی دلچسپی کیوں رکھتے ہیں؟“

کہنے لگے: ”میں ایک ایسے اخبار کا نامہ نگار ہوں جو سنی خیز خبریں چھاپتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اخبار کے لئے ایک اچھی خبر کا مواد نامتھ لگے گا۔ مگر یہاں تو حالت ہی دوسری ہے۔“

رخصتہ ہونے سے پہلے کہنے لگے: ”اگر مستقبل قریب میں آپ

کے محلے میں کوئی سنسنی خیز واقعہ ظہور میں آجائے۔ تو مجھے ضرور اطلاع
دیجئے۔ میں آپ کو گاہے بگاہے ملتا رہوں گا۔“

اس ملاقات کے بعد وہ مجھے اکثر ملے۔ اور ہر بار انہوں نے مطالبہ
کیا۔ ”کہیے کوئی تازہ واقعہ ہوا؟“

میں نے ہر بار انکار میں سر ملا دیا۔ ایک دن غصے میں آکر کہنے
لگے۔ ”کیسا محلہ ہے آپ کا۔ یہاں کوئی واقعہ نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا
ہے آپ کو شش ہی نہیں کرتے۔“

چند دنوں کے بعد ہمارے محلے میں دو سائڈ لٹری پڑے۔ میں نے
انہیں اطلاع دے دی۔ وہ بھاگ بھاگ ہمارے محلے میں آئے مگر
ان کے آنے سے پہلے سائڈ لٹری جھگڑ کر کہیں جا چکے تھے۔

واقعہ کی تمام تفصیل نوٹ کرنے کے بعد کہنے لگے۔ ”سائڈ کہاں ہیں؟“
میں نے کہا۔ ”معلوم نہیں۔“ فرمانے لگے۔ ”آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔“

اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ میرے آنے تک روک ہی لیتے۔ میں نے حیران
ہو کر پوچھا۔ ”سائڈ تو شاید آپ کی کچھ مدد نہ کر سکتے۔“ انہوں نے چپیں جھپکیں
ہو کر کہا۔ ”میں سائڈوں کا فوٹو لینا چاہتا تھا۔ فوٹو کے بغیر خبر کچھ بیکسی
لگے گی۔“

کچھ اور دنوں کے بعد برسات شروع ہو گئی۔ ایک دن وہ پھر میرے
ہاں تشریف لائے اور کہنے لگے۔

”آج میں ضرور ایک اچھی خبر کے لئے مواد لے کر جاؤں گا کہنے آپ

کے محلے میں کتنے مکان گرے۔ کتنے آدمی زخمی ہوئے۔ کتنے مرے؟
میں نے جواب دیا۔ ”آپ کو سن کر مایوسی ہوگی کہ فی الحال ایک
بھی نہیں۔“

”لیکن کچھ مکانوں کے گرنے کی توقع کی جاسکتی ہے؟“
”ابھی سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

”عجیب بات ہے۔ سب کچھ مکان ہیں اور کم بخت ایک بھی گرنے
کو تیار نہیں۔“

ایک بار مال روڈ پر سیر کرتے ہوئے ملے۔ فرمانے لگے۔ آج مزا آگیا۔
ایک موٹر اور لاری میں ایسی زبردست ٹکڑ ہوئی۔ کہ تمام مسافر جان بحق
ہو گئے۔ جتنے کہ ڈرائیور بھی۔ ہنسی کو بمشکل ضبط کرنے کے بعد کہنے لگے۔
”آپ نے دیکھا ہوگا۔ کہ جب بھی دو گاڑیوں کی ٹکڑ ہوتی ہے یہ کمبخت
ڈرائیور عموماً بچ جاتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ پہلا سانحہ ہے۔
جس میں دونوں میں سے ایک ڈرائیور ابھی جانبر نہ ہو سکا۔
میں نے سانحے پر رسمی افسوس ظاہر کیا۔ بولے۔

”خوشی کی بات تو یہ ہے کہ اتنے دنوں کے بعد ایک دلچسپ سانحہ
ہوا۔ ہر روز مال روڈ سے مایوس ہو کر گھر جانا پڑتا تھا۔ آج ایک خبر
ہاتھ لگی۔ ورنہ آپ.....“ جب وہ بات کر رہے تھے۔ فائر
بریکیڈ ٹن ٹن کرتا مال روڈ سے گذرا۔ بات چیت کئے بغیر وہ سائیکل
پر سوال ہو کر فائر بریکیڈ کے پیچھے پیچھے ہوا ہو گئے۔ شام کو ملے۔ اور

میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہنے لگے۔ ”بھئی! کمال ہو گیا۔ پر ماتما جب دینے پر آتا ہے۔ تو پھیر پھاڑ کر دیتا ہے۔ ایک ہی دن میں دو دو مزیدار خبریں۔ ایسی آگ لگی کہ ایک چھوڑ دو مکانات جل کر راکھ ہو گئے۔ تین لاکھ کا نقصان ہوا۔ بخدا مزا آگیا۔“

”ہگ کہاں لگی تھی؟“

”گوالتندی میں۔ گند انجن کے قریب۔“

”دونوں مکان جل گئے؟“

”بالکل! میں کہتا ہوں ایک اینٹ تک نہیں بچی۔“

”کافی نقصان ہوا ہوگا۔“

”ہاں نقصان تو ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے اگر آگ لگے تو

لیکن.....“

”لیکن؟“

”کم از کم دو کالم کی خیر لگے گی۔ دو کالم کا مطلب ہے.....“

”مطلب ہے؟“

”بیس روپے۔“

ایک لمحہ کے سکوت کے بعد کہنے لگے۔ ”ایسی خبریں قسمت سے ہی ہاتھ آتی ہیں۔ ذرا خیال کیجئے۔ اگر ہر روز ایک آدھ ایسی خبر مل جائے۔

تو کتنے کالم بن سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے بیس ضرب بیس چھ سو

روپیہ ماہوار۔“

اس ملاقات کے بعد وہ مجھے پندرہ بیس روزہ ملے۔ ایک دن لارنس گارٹون میں سیر کرتے ہوئے اتفاقاً ان سے تصادم ہو گیا۔ میں نے پوچھا ”کیسے کیا حال ہے؟“ جواب میں کہنے لگے ”چند دنوں سے حال بہت پتلا ہے۔ کوئی چیز دستیاب نہیں ہوئی۔ کچھ مدد کیجئے۔“ میں نے مسذوری ظاہر کی۔ فرمانے لگے ”اچھا کوئی بات سنائیے شاید کوئی مواد مل جائے۔“

میں نے برسبیل تذکرہ کہا ”آج کل محلے میں آوارہ کتوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میونسپلٹی اس معاملے کی طرف مطلقاً توجہ نہیں دے رہی۔“

”خوب! اور کوئی بات؟“

”کالج کے تنظیمین روز بروز سخت ہو رہے ہیں۔ کام زیادہ لیتے ہیں۔ تنخواہ بڑھاتے نہیں۔ یہ قومی کالج کا ہے کو ہیں۔ لوچڑ خانے ہیں۔“

”بالکل بجا ہے۔ اور کیسے؟“

”لارنس گارٹون میں ان دنوں نئے شادی شدہ جوڑے بڑی آزاوی سے گھومتے ہیں شاید اس لئے کہ موسم بہار ہے۔“

”درست ہے۔“

”شہر میں چوریوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چوروں کے حوصلے بڑھ گئے ہیں۔ کل ایک بے چاری بڑھیا کو دن

دھاڑے لوٹ لیا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔“

اس قسم کی ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تین چار دنوں کے بعد مجھے پرنسپل صاحب کا بلاوا آیا۔ جب میں ان کے دفتر میں داخل ہوا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ بہت سیخ پا ہیں۔ انہوں نے ”سنسنی خیز بمبئی“ کا تازہ پرچہ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے متعلق اپنی پوزیشن کی وضاحت کیجئے۔ ایک خبر کا عنوان جلی حروف میں میری آنکھوں کے سامنے لپچنے لگا۔ لکھا تھا۔

”قومی کالج دکانیں نہیں بلڈ بینک ہیں۔ جہاں غریب پروفیسر

کا خون سٹوڑا جاتا ہے۔“

”انٹرنیشنل کالج کے پروفیسر کا سنسنی خیز انکشاف“

”تنخواہ پچاس روپے۔ کام پندرہ گھنٹے روزانہ“

”میں نے جلدی جلدی خبر پڑھی۔ نامہ نگار صاحب نے میرے نام

اور پورے پتہ کے حوالے سے نہایت سنسنی خیز انکشافات کئے تھے۔

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ پرنسپل صاحب نے گرج کر کہا۔

”یہ ایسی حرکت ہے جسے کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔ ایک مہینے کے بعد اپنا انتظام کر لیجئے۔ کہ نوٹس کی میعاد ایک مہینہ ہے۔“

دوسرے دن مجھے میونسپل کمیٹی کے صدر کا ایک خط ملا۔ جس میں لکھا

تھا کہ آپ نے اخبار ”سنسنی خیز“ کے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے صاف

دردغ بیانی سے کام لیا ہے۔ شہر میں جہاں تک میونسپلٹی کو علم ہے ایک بھی ہاولا گنا نہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ دھوبی محلہ میں آدمیوں کی بہ نسبت باڈے کتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اور اس وقت تک کم از کم ۵۰ آدمیوں کو باڈے کتوں نے کاٹ کھایا ہے۔ ایک ایسا جھوٹ ہے جس کی توقع ایک پڑھے لکھے آدمی سے نہیں کی جاسکتی۔ چہ جائیکہ وہ ایک ذمہ دار پروفیسر بھی ہے۔

تین چار دنوں کے بعد نامہ نگار صاحب پھر ملے۔ کہنے لگے۔ ”آپ نے ”سشنی خیر بھٹی“ کے کامروں میں پڑھ لی یا ہوگا کہ میونسپلٹی اور کالج کے منتظمین کی میں نے کیسی خبر لی ہے۔ کہتے۔ آج کچھ نیا مصالحہ بہم پہنچائیں گے یا نہیں؟“

میں نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ”نیا مصالحہ تو بعد میں دیکھا جائیگا۔ پہلے میرے لئے ملازمت کا بندوبست کیجئے۔“

اندھیرا ہوتا تھا کہ سرچ لائیٹ کی مدد سے بھی بہت کم چیزیں دیکھی جا سکتی تھیں۔ اس لئے وہ کچھ دیکھے سے بغیر بڑے اطمینان سے محل کو لوٹ آتا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا کہ اس کی رعیت خوشحال ہے۔ ایک دن نہ جانے اسے کیا سوچھی کہ اس نے رات کے بجائے دن کو اپنی راجدھانی کا گشت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ جب قلعے کے گھڑیال نے دس بجائے۔ چوہٹ راجا ایک سحرے کے بھیس میں محل سے روانہ ہوا۔ سڑک پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اگر دنیا کے تمام ممالک کے "سیر" والا اصول اپنائیں تو مہنگائی کا فوراً خاتمہ ہو جائے۔ اور یہ سوچتے سوچتے وہ لنگنا نے لگا۔

لنگے سیر بھاجی - لنگے سیر کھا جی

جب وہ اس مصرعہ کو پچاس بار لنگنا چکا۔ تو وہ کچھ تھک سا گیا۔ اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر آرام کرنے لگا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ معاً اس کی آنکھ لگ گئی اور اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کی راجدھانی میں تمام عمارتیں سونے اور چاندی کی بنی ہوئی ہیں۔ حور شمائل بیویاں ناگور کی بہترین شراب کے جام لٹھا رہی ہیں۔ اور بدست خاوند گاؤں کیوں کے سہارے لیٹے ہوئے "رباعیات عمر خیام" پڑھ رہے ہیں۔ وہ یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اتنے میں ایک رقاصہ سا غربگت اس کی جانب بڑھی ایک نہایت دلکش لڑکے ساتھ اس نے جام اس کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ شراب پینے لگا۔ اور رقاصہ نے ناچنا شروع کیا۔ یک لخت

رقاصہ نے ناچتے ناچتے ایک ولدوز چنچ بلند کی۔ چوہٹ راجا کے ہاتھوں سے
بیالہ گر پڑا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ رقصہ غائب
ہو چکی تھی۔ اور اس کی بجائے ایک نوجوان درخت کے تنے سے لپٹا ہوا
دھڑلے مار مار کر رو رہا تھا۔ چوہٹ راجا اس کے پاس گیا اور یوں گویا
ہوا۔ ”اے نوجوان! تو کیوں رو رہا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اندھیر نگری
میں ہر شخص خوشحال ہے۔ کیونکہ یہاں ہر چیز ٹکے سیر بکتی ہے۔“

نوجوان نے سر دھڑکے بھر کر کہا۔ ”کاش! ایسا ہوتا۔“
چوہٹ راجہ نے جھٹکا کر کہا۔ ”تو گویا تجھے اس میں کلام ہے کہ یہاں ہر
چیز ٹکے سیر نہیں بکتی۔“

نوجوان نے اثبات میں سر ملایا۔ چوہٹ راجا کا چہرہ غصے سے سرخ
ہو گیا۔ اس نے تلوار میان سے نکالی۔ اور کہنے لگا۔ ”سچ بتا۔ تو
کون ہے اور تجھے اندھیر نگری پر ہمتیں تراشنے کا کیا حق ہے؟“
نوجوان نے نہایت عاجزی سے جواب دیا۔ ”میں خدا کو حاضر و

ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے۔ سچ ہے۔“

”ثبوت؟“ چوہٹ راجا نے غر کر کہا۔

”ثبوت فراہم کر سکتا ہوں۔ اگر میرے ساتھ چلو۔“

”میں تیار ہوں۔“

نوجوان چوہٹ راجا کو ساتھ لے کر بارادری طرف چل دیا۔ ایک کان
کے سامنے جس پر ”خالی ہے“ کا لورڈ آویزاں تھا۔ نوجوان رک گیا اور

جب وہ ایک انگریز خاتون سے ملا۔ تو اس کا یہ احساس ایک نہایت طنز پر لطف کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس خاتون نے کپور کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے کہا۔ کپور صاحب !

“YOU ARE AS THIN AS A NEEDLE”

کہ آپ تو اتنے پتلے ہیں جتنی سوئی ہوتی ہے۔ کپور نے بے ساختہ بھولپن سے جواب دیا۔ محترمہ ! آپ ذرا مبالغہ سے کام لے رہی ہیں۔ چند ایک سوئیاں مجھ سے موٹی بھی ہوتی ہیں۔

اسی لئے عورت کے متعلق کپور کا خیال ہے کہ وہ کم بخت جسم پر مرقی ہے دماغ پر نہیں۔ اور دماغ پر شاید اس لئے نہیں مرقی۔ کہ بے چاری کے پاس دماغ ہوتا ہی نہیں۔ (شاید کپور مردانہ بہتری سے واسن نہیں چھڑا سکا)۔

جب وہ کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہو۔ تو اس کے سخرے کیر کیر پیس سونے پر سہاگہ کا کام ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ لہراتے اور تھومتے ہوئے کوٹ پتلون کپور سے لگا تو کھا نہیں سکتے۔ اس لئے اس کے پتلے پتلے جسم کی غمازی کرنے کے فعل میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ دنیا کا بڑے سے بڑا درزی بھی شاید اس منحنی اور پھکیلے جسم پر کسی قسم کا سوٹ فٹ نہ کر سکے۔ ویسے میں نے کئی بار چاہا ہے کہ یوں کوٹ پتلون پہنے ہوئے کپور سے جا کر کہہ دوں۔ ”طنز نگار ! اگر تمہارے ہاتھ میں چھٹی دے دی جائے۔ اور سر پر میناری فلیٹ اور اس کے ساتھ ہی خوشنختی ڈاڑھی

دکاندار سے کہنے لگا۔ ”مجھے یہ دکان چاہئے۔ اس کا کیا کرایہ ہوگا؟“
 ”کرایہ تو بعد میں دیکھا جائیگا۔ پہلے نذرانہ کا فیصلہ کر لیجئے۔“
 ”نذرانہ؟“ چوہٹ راجہ نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں صاحب! نذرانے کے بغیر آپ کوئی چیز اس راہدہانی میں لے ہی نہیں سکتے۔“

”اچھا تو اس کا کرایہ اور نذرانہ جدا جدا بتائیے گا۔“

”کرایہ صرف ایک ٹکہہ۔ نذرانہ پچاس ہزار ٹکے۔“

چوہٹ راجہ پر جیسے بجلی گری۔ ”یہ کیا مذاق ہے؟“ اس نے چیخ کر کہا۔

”مذاق نہیں صاحب یہ دستور ہے!“

”تو کیا ہمیں واقعی نذرانہ.....؟“

”جی ہاں! اگر آپ کی جیب میں پچاس ہزار ٹکے ہیں تو شوق سے یہ دکان لے لیجئے۔“

”ورنہ؟“

”اپنا راستہ پکڑ لیجئے۔“

چوہٹ راجہ اور نوجوان منہ ٹکائے وہاں سے آگے چل پڑے۔ چوہٹی وہ چوک کے قریب پہنچے انہیں رونے اور چیخنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پہلے ایک چیخ۔ پھر دوسری۔ تیسری۔ چوتھی۔ اس کے بعد تو گویا کہرام مچ گیا۔ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے وہ دونوں چوک میں پہنچے۔ یہاں آکر

دیکھا کہ ننگ دھڑنگ لوگوں کا ایک ہجوم ہے۔ اس ہجوم میں بچے عورتیں
جوان بوڑھے سبھی شامل ہیں۔ اور سپاہی ان کی پیٹھ پر زور زور سے کوڑے
برسا رہے ہیں۔ چوٹ راجا نے ایک سپاہی سے پوچھا۔ ”ان لوگوں کو کیوں
زد و کوب کیا جا رہا ہے۔ کیا انہوں نے چوری کی ہے؟“

”نہیں“

”ٹاکہ مارا ہے؟“

”نہیں“

”کسی کو قتل کیا ہے؟“

”نہیں“

”تو پھر“ اس نے تلملا کر کہا۔ ”انہیں کیوں پیٹا جا رہا ہے؟“
”انہوں نے ایک ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے کہ سنو گے۔ تو
جبران رہ جاؤ گے۔“ سپاہی نے جواب دیا۔

”وہ کونسا ایسا جرم ہے؟“

”ان خبیثوں نے بڑوک سے تنگ آ کر چلانا شروع کر دیا ہے۔“

”یہ تو ایک نہایت فطری سی بات ہے۔“

”فطری سی بات! ہا ہا ہا! تم بھی ایک مسخرے ہو۔ بھلا بھوک سے

تنگ آ کر چلانا کہاں کی شرافت ہے؟“

”اگر کسی شخص کو بھوک لگے۔ روٹی نہ ملے۔ تو پھر وہ کیا کرے؟“

”کیا کرے! ہا ہا ہا! چونچ کو پردوں تلے دبا کر گھٹ کر مر جائے۔“

” لیکن میں نے سنا ہے کہ اس شہر میں گیموں اور چاول ٹکے سیربک رہے ہیں۔ پھر یہ لوگ خواہ مخواہ کیوں بھوکے مرتے ہیں۔“
 ” تم بھی یا روقتی ہونق ہو۔ یہ لوگ اتنے کیسے ہیں کہ ان کی جیبوں میں ایک ٹکہ بھی نہیں۔“

چوہٹ راجا اور اس کا ساتھی یہ ٹکسا جواب سن کر وہاں سے آگے چلے۔ بازار کے سرے پر انہیں ایک بڑھیا ملی جس نے آہ و فغاں سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ چوہٹ راجہ نے اس کے قریب جا کر نہایت ہمدردی سے پوچھا۔ ” بہن نہنیں کیا رنج پہنچا۔ جو تم اتنی دردناک آواز میں فریاد کر رہی ہو؟“

بڑھیا نے چھاتی پر دو ہاتھ مارتے ہوئے جواب دیا۔ ” اے لوگو! میں لٹ گئی۔ برباد ہو گئی۔“

” لیکن ہوا کیا؟ آخر بات تو بتاؤ“ چوہٹ راجہ نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

” تم سنو گے میری بیٹا۔“ بوڑھی عورت نے ذرا صبر سے کہا۔ ” سننے کے لئے کلیجہ کہاں سے لاؤ گے؟“ وہ سر پیٹ کر رونے لگی۔

” پھر بھی بتاؤ تو سہی شاید ہم کچھ تمہاری مدد کر سکیں“ نوجوان نے نہایت نرمی سے کہا۔

” تو سنو۔ میں ایک غریب مزدور کی بیوی ہتی۔ پچھلے دنوں جب قریب قریب تمام لوگ پاگل ہو گئے۔ تو چند آدمیوں نے جن سے میری کوئی

عداوت نہ تھی میرے گھر پر حملہ کر دیا۔ میرے خاوند کو گولی مار دی اور میری نوجوان کنواری لڑکی کو بڑھیا کا دل بھرا آیا اور وہ پھر آنسو بہانے لگی۔

”ہاں ہاں! پھر کیا ہوا؟“

”میری نوجوان لڑکی کو اٹھا کر لے گئے۔ اور اندھیر نگری کے بڑے بازار کے چوک میں اس کے کپڑے اتار اس کی عصمت کو نیلام کرنا شروع کر دیا۔“

”پھر؟“

”پھر اسی نگری کے ایک شخص نے ایک ٹکے کے عوض اس کی عصمت کو خرید لیا۔“

”ایک ٹکے میں؟“ چوہٹ راجہ نے حیران ہو کر کہا۔ ”عصمت کی قیمت صرف ایک ٹکے“

”ہاں“ بڑھیا نے روتے ہوئے جواب دیا۔ ”لوگ کہتے ہیں کہ اس نگری میں

یہی دستور ہے۔“

چوہٹ راجا اور اس کا ساتھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور انہوں نے محل میں پہنچ کر دم لیا۔ جب ان کے ہوش و حواس بجا ہوئے تو چوہٹ راجا نے نوجوان کو اپنا تیز رفتار گھوڑا پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”جتنی جلدی ہو سکے۔ اندھیر نگری سے بھاگ جا۔“

اور کہا جاتا ہے کہ اس رات چوہٹ راجا نے اپنی مہارانی کی لمبی لطف کا پھندا اپنے گلے میں ڈال کر خودکشی کر لی +

گبارِ کھاتر

(پنڈت اَب بِل کلام آجائے ہجرت (معدت) کیسا) تھ

شکھیکے موہ ترم (شفیق محترم) !
 سے انکلا بات ہیں جہانے کے۔ کہاں کلا (قلعہ) احمد نگر کہاں دلی اکل اسیرے
 دے فرنگ تھا۔ آج اسیرے کھے (حم) جلفے (زلعت) ہندی ہوں۔ اتر تھا
 یعنی ”یعنی“ بھارت ورش کے شکھشا منتری کی حیثیت سے ہندی جہان
 کا پرچار کر رہا ہوں۔ شکھشا منتری ؟ جانے تمہاری بلا۔ بھٹی وجیرے
 تالیم۔ مات کیجے گا شپھیک کہ اردو میں کھت لکھنے کے بجائے ہندی
 بھاشا میں پتر لکھ رہا ہوں۔ یہ تو تم نے سن ہی لیا ہوگا کہ ۲۶ نومبر کو

دلی میں اُردو کی فاتحہ پڑھی گئی۔ اور اُردو کا جناجا اسی دیرانے میں ٹھکانے لگادیا گیا۔ جہاں گلاب مرحوم کی کبر ہے۔ بات تو کچھ عجیب سی تھی۔ لیکن جن حجرات نے اس جناجے کو کندھا دیا۔ ان سب میں نیکیر (فقیر) پیش پیش تھا کہ اس نیکیر کو اردو مرحوم سے ہمیشہ اکیدت (عقیدت) رہی۔ مائے اُردو! اے اُردو! جی چاہتا ہے۔ آدیت سے بھی مجبور ہوں۔ کہ کوئی پھر کٹا ہوا شیر (شعر) لکھوں کہ جسے پڑھ کر تمہاری رُوح لرج اٹھے۔ لیکن ابھوس شپھیک! ہندی جہان میں کوئی وجندار شیر نہیں ملتا۔ کبیر بھگت کا ایک دوہا ہے۔ اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہاڈ جلع جوں لکڑی کیس جلع جوں گھاس
جلیتی چٹا دیکھ کے بھٹے کبیرا داس

کہو گے تو سہی کہ سادی (سعدی) حاج (حافظ) اور گلاب (غالب) جن کے مجھے لاکھوں اش آر یا دیں کیا ہوئے مے دے کے کبیر بھگت کیوں؟ جانے من (جان من) ہندی جہان میں ع غ ظ میرے سے ہی منکود ہیں۔ اگر ان شورا (شعرا) کے اش آر ہندی میں لکھے جائیں تو الفاج (الفاظ) اجیب و گریب شکلیں اکھتیار کر لیتے ہیں۔ مسال کے طور پر گلاب کے اڑینگے پڑجے۔ ”کا با کس منہ سے جاؤ گے گلاب“ مے سے گرج نشات ہے کس رو سیاہ کو۔ صاف جاہر ہے کہ یہ اش آر ہندی میں نہیں لکھے جاسکتے۔ ہاں یاد آیا۔ ان دنوں دیوانے گلاب (دیوان غالب) کا ہندی ایڈیشن تیار کر رہا ہوں۔ پڑھو گے تو دانتوں میں انگلیاں دبا کر

رہ جاؤ گے!

بہت دنوں کے بعد کھت لکھنے کی توفیق ہوئی ہے۔ وجہ یہ کہ بہت
 مسرور رہا ہوں۔ بارے آج کچھ فرصت ملی۔ مثالہ (مطالعہ) کا یہ حال
 ہے کہ اس کے بھی جب تمہیں کھت ملے رہا ہوں۔ تلسی رامائن بھر کے
 سامنے ہے۔ سامنے کی الماری میں رکھا ہوا دیوانے حافج "میری طرف
 آشکار آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ لیکن کیا کروں بھارت کے شکشا
 منتری ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ جیب (زیب) نہیں دینا کہ حافج
 کا شہ-انی ہوتے ہوئے بھی دیوانے حافج پڑھ سکوں کسی ملاقاتی نے دیکھ لیا
 تو گجب ہو جائیگا۔ بھارت ورش کے اکھباری ہلوں میں بلچل چ جائے گی۔
 کہ آجاد بھارت ورش کا شکشا منتری آجاد جو جلسوں اور سیمینوں میں لوگوں
 کو ہندی سیکھنے کی ترغیب دیتا ہے کھڑ چھپ چھپ کر دیوانے حافج پڑھتا ہے۔
 شپھیک اسے سمجھنے کی بات ہے کل کالب کا دور تھا۔ آج تلسی داس کا
 ہے دل پر جو گجرتی ہے سو گجرتی ہے۔ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں لیکن حالات کا
 نکلا جا ہی ہے کہ دن رات ہندی پڑھے جاؤں اور اپنی اردو کھرب کئے جاؤں
 سچ کہا ہے تلسی داس نے

بروز مال مانس بکے چند رشیت رو گئی گھم موہ مداک جو تجھے تلسی تجھے نہ رام
 اس شیر کے کیا مانے (معنی) یہ تو میں کھ نہیں جانتا لیکن اسے شپھیک الی گڑھے میں
 کوئی پنڈت تو جبرور ہو گا اس سے پوچھ لیجئے گا اور اگر ہو سکے تو مولانا اب بل کلام کی یاد
 میں دو آنسو بہا دیجئے گا کہ کبھی اس کی اردو کی سائے ہندوستان میں صوم تھی یہ
 آپ کا:- پنڈت اب بل کلام آجاد

آزادی کی قسم

میں نرنے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ”باپو“ کے بیدارن کو کبھی نہیں بھونگا۔
 لیکن ”باپو“ کے بتائے ہوئے امور پر کبھی عمل نہیں کرونگا۔ میں بات بات
 میں گاندھی جی کی دہائی دوں گا۔ لیکن مجھے گاندھی جی کی دہائی دی جائے گی۔
 تو میں اس کی بالکل پروا نہیں کرونگا۔ ایک پتے دیش بھگت کی طرح دیش
 کار وہ اس وقت تک برباد کرتا نہ دوں گا۔ جب تک کہ دیش کا دیوال نہیں
 پٹ جاتا۔ بوٹھا۔ اندھا یا بہرہ ہو جانے کے بعد چاہے مجھے لاکھی کے سہارے
 یا سٹر پچر پر سوار ہو کر آنا پڑے۔ میں ریٹائر ہونا پسند نہیں کروں گا اور تب
 تک گدی سے چٹا ہونگا جب تک کہ میرا جنازہ دفتر سے نہیں نکلتا۔ میں
 تقریروں کا ایک ایسا سلسلہ شروع کروں گا۔ جو کبھی ختم ہونے کا نام نہ لے گا
 اپنی ہر تقریر میں وہی بات کہوں گا جو میں نے اس سے پہلی تقریر میں کہی ہوگی۔

چاہے نتیجہ کے طور پر لوگ تنگ آکر میری تقریر سننا چھوڑ ہی کیوں نہ دیں۔
جب تک دم میں دم ہے میں کسی نوجوان کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں دوں گا۔
جب تک کہ وہ میرا نزدیکی رشتہ دار نہ ہو۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ

میں بھول کر بھی ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے جننا کو فائدہ
پہنچنے کی امید یا امکان ہو سکتا ہو۔ مانا کہ جننا اب کافی سمجھ دار ہو چکی ہے۔
اور اسے بیوقوف بنانا آسان نہیں۔ پھر بھی میں اسے بیوقوف بنانے کی کوشش
کروں گا۔ جو لوگ میری باتوں میں آنے سے انکار کریں گے۔ انہیں عمر بھر کے
لئے جیل خانہ میں بھجوا دوں گا۔ اور قیامت تک یہ نہیں بتاؤں گا کہ انہوں
نے کونسا قصور کیا ہے۔ جتنے اسٹاف کی مجھے ضرورت ہوگی اس سے چوگنا
رکھوں گا۔ لیکن پھر بھی یہ شکایت کرتا رہوں گا۔ کہ آدمیوں کی کمی کے باعث
کوئی کام وقت پر نہیں ہو رہا۔ جننا کی ہر شکایت کو بڑے غور سے سنوں گا۔
اور سننے کے بعد بھول جاؤں گا۔ کہ وہ شکایت کیا تھی۔ کھانے پینے کی تمام
اشیاء پر کنٹرول لگاؤں گا۔ اور اس کے بعد جب وہ چیز بازار سے غائب
ہو جائے گی تو اس کا سبب یہ بتاؤں گا کہ راتوں رات ملک کی آبادی اس
قدر بڑھ گئی ہے کہ جننا کو وہ چیز پوری مقدار میں نہیں دلائی جاسکتی۔ خوراک
کی کمی پوری کرنے کے لئے ہر شخص سے درخواست کروں گا کہ وہ ہفتہ میں صرف
ایک دن کھانا کھایا کرے اور باقی کے چھ دن پیٹ پر پتھر باندھ کر سو جایا
کرے۔ کپڑے کا توڑا اس طرح پورا کروں گا۔ کہ کپڑے کے دام حد سے زیادہ

بڑھاؤنگا۔ تاکہ کوئی شخص کپڑا خرید ہی نہ سکے۔ بڑے بڑے پوسٹر لگا کر
 جتنا کو سمجھاؤنگا کہ فائدہ کرنا یا نہ کرنا صحت کے لئے کس قدر ضروری ہے۔
 سب سے بڑا کام یہ کرونگا۔ کہ ملک میں نہیں کروڑ ٹے درخت لگاؤنگا۔
 ان سے یہ فائدہ ہوگا کہ اتنی بارش ہوگی کہ نوح کے طوفان کی یاد تازہ ہو
 جائے گی۔ فصلیں ————— اگزیج طوفان میں بہنے سے بچ گئے۔
 لوٹی جائیں گی اور اتنا اناج پیدا ہوگا کہ جتنا کھا کھا کر
 بدحواس ہو جائے گی۔

دیش کی دولت بڑھانے کے لئے اپنے ہر ایک دوست کو امپورٹ
 لائسنس دلاؤنگا۔ جس سے وہ امریکہ سے سستی کتابیں اور ہنگامی شرب
 منگو کر غیر مناسب داموں پر فروخت کرے۔ اس طرح میرے دوستوں
 کے پاس بہت سا روپیہ جمع ہو جائے گا۔ اور ملک بہت جلد مالا مال ہو
 جائیگا۔ غریبوں کو طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر خوش رکھنے کی کوشش
 کرتا رہوںگا۔ اگر وہ بغاوت کریں گے۔ تو مذہبی کتابوں کے حوالے دے دے
 کر سمجھاؤنگا۔ کہ جو غریب اپنا حق مانگتا ہے وہ سیدھا نرک میں جاتا ہے۔
 جاگیر داری ختم کرونگا۔ مگر جاگیر داروں کو کسانوں سے اتنا روپیہ
 دلاؤنگا۔ جس سے وہ نئی جاگیریں خرید سکیں۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ

ہزاویہ تحریر و تقریر کو بالکل ختم کر کے چھوڑنگا۔ چاہے مجھے سارا
 PENAL CODE تبدیل کرنا پڑے یا ORDINANCES کا سہارا

کا اضافہ بھی کر دیا جائے۔ تو تم برنارڈ شا معلوم ہونے لگو ممکن ہے میرے اس مذاق کو کپور سنجیدگی کا روپ دے دے۔ اور کسی دن تنہائی میں اپنے لباس کو برنارڈ شا کے معیار کا لباس بنا کر دیکھ لے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے شا کی نقل کو بھونڈی نقل سمجھے گا۔ اور کبھی اسے عملی جامہ نہیں پہنائے گا۔

کپور کی عام زندگی جن جن سبجوں سے گزری۔ اس میں بہت کم اہم واقعات یا حادثات پائے جاتے ہیں۔ ایک اوسط ذہین لڑکے کی طرح میٹرکولیٹ، ایف اے بی۔ اے، اور ایم اے کے مراحل طے کرتا رہا۔ امتحانوں میں کبھی دوسرا اور کبھی چوتھا رہا۔ بقول کپور کے زندگی میں کبھی اول رہنے کے فخر کو برداشت نہیں کر سکا۔ ہاں جب پیدا ہوا۔ تو پہلی جنگ عظیم چھڑنے میں ابھی چار سال باقی تھے۔ اس لئے اس حادثے سے بھی محروم رہا۔ ایک بار موڈ میں آکر وزن تو لے والی مشین میں اکتی ڈال بیٹھا۔ بس پھر تو زبردستی ٹکنا پڑا۔ اور ثابت ہوا۔ کہ حضرت پچاس سیر سے کچھ زیادہ ہیں۔ اس وقت سے آج تک اس قسم کا موڈ دوبارہ پیدا نہیں ہوا۔ اور کپور صابر و شاکر ہو کر بیٹھ رہا۔ کوئی درزی جب اس کی قمیض کا ماپ لیتے وقت چھاتی ملنے لگتا ہے تو اسے نہایت بے تکلف انداز میں کہہ دیتا ہے۔ بھئی جانے دو۔ نہیں اسے زیادہ کبھی بڑھ ہی نہیں سکی کجنت!

گھر میں وہ باریک اور مہین ملل کی دھوٹی پہن کر پھرتا ہے لیکن

لیٹا پڑے۔ اس نیک کام کے لئے نئے آئین میں تین نئی مدد کا اضافہ کر دینا۔

(۱) ہر مرد یا عورت کو ستن وارنٹ اور جرم کے بغیر کسی بھی وقت گرفتار کیا جاسکتا ہے۔

(۲) مجرم کو عدالت میں پیش نہیں کیا جائے گا تاکہ وہ اپنا بے قصور ہونا ثابت ہی نہ کر سکے۔

(۳) مجرم کو ایک بار رہا کر کے پھر گرفتار کیا جائیگا۔ یہ گرفتاری جیل کے دروازہ پر عمل میں لائی جائیگی۔
میں قسم کھاتا ہوں کہ

اپنی غلطیوں کے لئے میں خود کو قصور وار نہیں ٹھہراؤں گا۔ زور سے چلا کر کہوں گا کہ گاڑیاں اس لئے دیر سے آتی ہیں کیونکہ انجن بڑھے ہو گئے ہیں۔ کھانا اس لئے نہیں ملتی کہ گنوں نے زمین سے اگنا بند کر دیا ہے۔ رشوت بڑھ رہی ہے۔ کیونکہ لوگوں کو رشوت دینے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ اناج کا توڑا اس لئے ہے کہ سارا اناج چوہے کھا گئے ہیں۔ اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے چاہے مجھے کتنا جھوٹ بولنا پڑے۔ میں بولوں گا۔ کیونکہ فتح آخر جھوٹ کی ہوتی ہے۔ اہنساکے اصول پر اس جتنک عمل کروں گا۔ کہ بھٹ کا صرف ساٹھ فی صدی حصہ جنگ کا سامان خریدنے پر صرف کروں گا۔ سچ مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ مگر سچی بات نہ بھی خود کہوں گا نہ کسی اور کو کہنے دوں گا۔

شراب نہیں پیوں گا۔ شراب کے بجائے غریبوں کا خون پی پی
کر گزارہ کروں گا۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ
میں یہ سب دلچسپ حرکتیں کروں گا۔ اور ان سے بھی نہ پاؤں
دلچسپ حرکتیں کرنے کو تیار رہوں گا۔ اگر سو رگ لوک "بابا" مجھے برا بھلا
کہیں گے یا میری بے شرمی پر آنسو بہائیں گے تو میں جان بوجھ کر
بہرا اور اندھا بن جاؤں گا۔

آزادی کے دن میں عزم کرتا ہوں کہ
میں دلش کو تباہ کر کے دم لوں گا۔ پر مانتا مجھے ہمت اور توفیق ہے
کہ میں اپنے عزم کو پورا کر سکوں۔

وزیر ٹکیس

اس دن جب مجھے وزیر ٹکیس کا خط ملا تو میں بہت حیران ہوا۔
وزیر ٹکیس سے میری رسم درآہ تک نہ تھی۔ اور مجھے سان گمان نہیں
تھا کہ وہ مجھے نہ صرف خط لکھے گا بلکہ اپنے یہاں چائے پر مارے بھی
کرے گا۔ وزیر ٹکیس نے لکھا تھا۔

محترمی!

مجھے آپ کی آج بہت ضرورت ہے۔ اگر ہو سکے۔ تو چار بجے میرے
یہاں تشریف لائیے اور میرے ساتھ چائے پیجئے۔ آپ سے بہت ضروری
باتیں کرنی ہیں۔

مخلص:-

وزیر ٹکیس

یہ خیال کرتے ہوئے کہ وزیر ٹیکس جیسے سمجھ دار آدمی سے ضرور کوئی غلطی ہوتی ہے یعنی اس نے یہ دعوت نامہ کسی اور کو بھجوانے کی بجائے مجھے بھجوا دیا ہے۔ پہلے تو میں اس کے ہاں جانے سے جھجکا۔ لیکن جب تین بجے وزیر ٹیکس کے سکریٹری نے فون پر مجھ سے وقت مقررہ پر پہنچ جانے کی درخواست کی تو میں یہ سمجھا کہ وزیر ٹیکس ضرور کسی ناگہانی مصیبت میں پھنس گیا ہے اور اسے میرے مشورے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں ٹھیک چار بجے اس کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔

”جے ہنر۔ مزاج کیسے ہیں؟ آج موسم خوشگوار ہے۔ تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ! وغیرہ وغیرہ رسمی باتوں کے بعد وزیر ٹیکس مجھے اپنے ڈرائیونگ روم میں لے گئے۔ اور ایک پُر تکلف کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہیرا چائے لایا۔ وزیر ٹیکس نے میرے لئے چائے کا پیالہ بناتے ہوئے کہا ”آپ حیران ضرور ہونگے کہ میں نے آپ کو بلوایا۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ مجھے واقعی آپ کی ضرورت ہے۔“

”فرمائیے! میں نے عاجزی سے کہا ”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ بڑے ذہین آدمی ہیں۔“

”صاحب! میں کیا ہوں۔ یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے۔“

”کسر نفسی کی ضرورت نہیں۔ آپ واقعی بڑے ذہین آدمی ہیں۔“

اور مجھے اس وقت واقعی ذہین آدمی کی ضرورت ہے۔“
”فرمائیے!“

”آپ جانتے ہیں میں خسارے کا بجٹ تیار کرنے میں ماہر ہوں۔“
”بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تین سال ہوئے آپ نے بجٹ
میں پچاس کروڑ کا خسارہ دکھایا تھا۔ پچھلے سال ستر کروڑ۔ اور اس
سال تو آپ نے اپنے تمام پچھلے ریکارڈز مات کر دیئے۔ یعنی ننانوے
کروڑ!“

”بس اسی کے متعلق آپ سے مشورہ کرنا ہے۔“
”گستاخی معاف! لیکن مجھے بجٹ تیار کرنے کا کوئی تجربہ نہیں۔ سچ
تو یہ ہے کہ میں اپنا ذاتی بجٹ تیار کرنے میں بھی اکثر شکام رہتا ہوں۔
اسی کو لیجئے۔ کہ آج مہینے کی بیس تاریخ ہے اور میرے بٹوے میں صرف
ایک کھوٹی چوٹی ہے اور ابھی بجلی کا بل۔ درزی کا بل۔ دھوبی کا بل۔
اور اسی قسم کے متعدد اور بل مجھے ادا کرنے ہیں اس حالت میں“
”چھوڑیئے یہ قصہ۔ وزیر ٹیکس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔
”آپ کے بٹوے میں کم از کم کھوٹی چوٹی تو ہے۔ یہاں میرے خزانے میں
چھوٹی کوڑی تک نہیں۔“

”عجیب بات ہے۔ لیکن آپ اتنے نئے ٹیکس ہر سال لگاتے ہیں۔
وہ روپیہ کہاں جاتا ہے؟“

”آپ بھی عجیب سادہ لوح ہیں۔“ وزیر ٹیکس نے ذرا بے تکلف

ہوتے ہوئے کہا ————— ”یہ بھی نہیں جانتے کہ اگر ادھر میں نئے ٹیکس لگاتا ہوں تو ادھر فوراً اخراجات بڑھادیتا ہوں۔ اس حالت میں خزانے میں کچھ بچ رہنے کے کیا امکانات ہیں۔“

”لیکن آپ اخراجات کیوں بڑھاتے ہیں؟ میں نے ذرا چین چیں ہو کر پوچھا۔

”اخراجات نہ بڑھاؤں۔ تو خسارہ کیسے دکھا سکتا ہوں؟“

”خسارہ نہ دکھائیے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”خسارہ نہ دکھاؤں؟“ وزیر ٹیکس نے چمک کر کہا۔ ”تو پھر وزیر ٹیکس کیسے رہ سکتا ہوں؟ پھر تو مجھے وہی کام کرنا پڑے گا۔ جو۔

پیشہ آبا ہے“

”یعنی —————؟“

”خیر چھوڑئیے یہ قصہ۔ ہاں تو بات یہ ہے کہ مجھے اخراجات بڑھانا ہی پڑتے ہیں۔ دراصل میں اس معاملہ میں کچھ مجبور سا ہوں۔ اب اس سال ہی دیکھئے.....“

”ہاں ہاں اس سال.....“

”اس سال میں نے نوئے وزیر مقرر کئے۔ دس نئے سفیر غیر مالک میں بھیجے۔ پانچوئے سکریٹری تعینات کئے۔ ساڑھے سات سو ڈپٹی سکریٹری۔ پندرہ سو اسٹنٹ ڈپٹی سکریٹری آدیاگر سب اسٹنٹ ڈپٹی سکریٹریوں کی تعداد پچھو تو شاید بتا بھی نہ سکوں۔“

”نو وزیر! دس سفیر! یہ تو ناقابل یقین سی بات معلوم ہوتی ہے۔“
 ”ناقابل یقین؟ اچھا لگن لیجئے“
 وزیر قمر، وزیر جلسہ، وزیر جلوس، وزیر جیل، وزیر مذاق، وزیر حادثہ، وزیر
 اعداد و شمار۔

”اور سفیر کون سے نئے ممالک میں بھیجے؟“

”ان ممالک کے نام تو مجھے بھی اچھی طرح نہیں آتے۔ بس یہ سمجھ لیجئے
 کہ اب دنیا کے کونے کونے میں ہمارے سفیر ہیں۔ مثلاً ایک جزیرہ جگ جگ
 لگ لگ ہے۔ بحر الکاہل میں ہے یا شاید بحر اوقیانوس میں۔ اس کا رقبہ
 صرف ایک مربع میل ہے۔ آبادی پچاس ساٹھ کے قریب ہوگی۔ وہاں میں
 نے ابھی ابھی ایک سفیر کو تعینات کیا ہے۔“

”لیکن یہ نئے وزیر اور سفیر کچھ کام بھی کرتے ہیں یا محض اخراجات
 بڑھانے کے کام آ رہے ہیں؟“

”اخراجات بڑھانا ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن اس کے
 علاوہ بھی یہ اور بہت سے کام انجام دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وزیر
 قحط کو لیجئے۔“

”ہاں ہاں! ان حضرات کا کیا کارنامہ ہے؟“

”ان کا کارنامہ یہ ہے کہ یہ ملک کی ہر چھوٹی بڑی ریاست پر قحط
 مسلط کر رہے ہیں۔ ابتداً انہوں نے ایک شمال مشرقی ریاست سے کی
 ہے۔ لیکن اتنا کہاں کرینگے۔ اس کا علم ان کے بدو کسی کو نہیں۔ یہ حضرت

کیجئے گا۔ پس نرے کاٹھ.....“

”بس بس آگے مت کیجئے۔ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن...

لیکن سگائی کا ٹیکس سے کیا تعلق ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔“

”میرا مطلب ہے سگائی ٹیکس۔“

”اچھا۔ اچھا سگائی ٹیکس۔ خوب۔ خوب! بہت دُور کی سوجھی

بھٹی واہ کیا بات ہے۔ سگائی ٹیکس۔ واقعی آپ وہیں ترین آدمی

ہیں۔“

”آپ کی ذرہ نوازی ہے۔“

”اچھا بھلا اندازاً بتائیے۔ آپ کے ملک میں ہر سال کتنی سگائیاں

ہوتی ہیں؟“

”یہ تو کسی پنڈت سے دریافت کیجئے۔“

نہیں نہیں۔ مذاق چھوڑئیے۔ بتائیے۔“

”کوئی دس بارہ لاکھ۔“

”ٹھیک! اگر ہر سگائی پر دس روپے ٹیکس لگایا جائے تو ایک کروڑ سے کچھ زیادہ آمدنی ہو سکتی ہے۔ اچھا اور کوئی ٹیکس تجویز کیجئے۔“

”پیدائش ٹیکس۔“

”بہت خوب۔ بہت خوب! میرے خیال سے اپنے ملک میں ہر

سال پچاس لاکھ نئے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ پانچ روپے فی بچہ ٹھیک

رہے گا۔“

پھر تاکھاں ہے وہ؟ پھر نے کی اس میں تاب ہی کہاں باقی رہ گئی ہے۔
وہ نو بس دھوتی پہن کر ریڈنگ روم میں پڑے ہوئے صوفے پر لیٹا
رہتا۔ اور پڑھتا رہتا ہے نہیں پڑھتا ہے بھٹی میں نے غلط کہا اسے
پڑھنے کے لئے دم ہی کون لینے دیتا ہے؟ وہ تو بمشکل صبح کا ڈیلی اخبار
سرسری نگاہوں سے دیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جونہی صبح وہ بغیر
مانتھ منہ دھوئے، واٹن کئے، دھوتی پہنے اس صوفے پر آکر بیٹھتا ہے۔
تو پلنے والوں کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے۔ ان پلنے والوں میں کالج کے فین
طالب علم ہوتے ہیں جو اپنے ذہن پر حلا کرنے کے لئے آتے ہیں اور پکوری
کے سامنے یوں بے تکلف بیٹھے رہتے ہیں۔ جیسے وہ ایک پروفیسر نہ
ہو۔ جس سے خوف کھایا جاسکے۔ بلکہ ایک ذہین ترین دوست ہو
جس سے گھل مل کر باتیں کی جاسکیں۔ اور اخذ لذت کے سامنے
اخذ علم کیا جاسکے۔ ————— پھر کئی ایک مفلس طالب علم ہوتے
ہیں۔ جو اس سے زندگی کے رُکے ہوئے دھارے کو آگے چلائے کے
مشورے حاصل کرنے آتے ہیں۔ کالج کی کتابوں کے پبلیشر ہوتے ہیں
جن کے بینک بیلنس کا بتدریج اضافہ، پکوری کے تیز و طرار قلم کار ہیں
منت ہوتا ہے۔ یہ پبلیشر اس کے آگے پروفوں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں۔
للچائی ہوئی نگاہوں سے اس کے قلم کو دیکھ کر چاہتے ہیں۔ کہ یہ قلم چلے
اور اس تیزی کے ساتھ چلے کہ کل صبح ہی انہیں ڈیڑھ سو صفحے کے پروف
تصحیح شدہ حالت میں ہی مل جائیں۔

”زیادہ ہے۔ غریب لوگ نہیں دے سکیں گے۔“

”تو پونے پانچ کر دیجئے۔ پچاس لاکھ ضرب پونے پانچ
کافی آمدنی ہو سکتی ہے۔ اب آگے چلئے۔“

”کفن ٹیکس“

”ہاں ہاں کفن ٹیکس ایکویں نہیں اگر ہیڈ ایش ٹیکس لگ سکتا ہے۔
تو کفن ٹیکس لگانے میں کیا مضائقہ ہے۔ اس ٹیکس سے بھی پچاس ساٹھ
لاکھ کی رقم دستیاب ہو سکتی ہے۔ چلئے یہ بھی نوٹ کر لیا۔ اور...“

”بکری ٹیکس“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ جو شخص بکری پالے اس پر ٹیکس لگایا جائے۔ آپ
جانتے ہیں کہ آج کل گائے یا بھینس پالنے کی بہت کم لوگوں کو توفیق ہے۔“
”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس ٹیکس کا دائرہ
ذرا وسیع ہونا چاہئے۔ کتنے ہی لوگ مرغیاں، بٹیریں، بطنیں، طوطے۔
کتنے۔ بلیاں اور جو بھی بھی تو پالتے ہیں۔“
”تو چلئے بکری ٹیکس کے علاوہ بٹیر ٹیکس، چوہا ٹیکس، مرغی ٹیکس
بھی لگا دیجئے۔“

”اچھا اب کوئی ایسی چیز بتائیے جسے ہر شخص استعمال کرتا ہو۔
میری رائے میں اگر اس پر ٹیکس لگایا جائے۔ تو معقول آمدنی ہو سکتی ہے۔“
”سو چنپا پڑے گا۔“

”ماں ماں دو تین منٹ سوچ لیجئے۔ میں اتنے میں سگریٹ پیتا ہوں۔“

دو تین منٹ کے وقفہ کے بعد میں نے کہا۔ ”میرے خیال میں ایسی صرف دو چیزیں ہیں۔“

”فرمائیے“

”شیشہ اور کنگھی“

”شیشہ اور کنگھی“! دزیرٹیکس نے کرسی پر اچھلتے ہوئے کہا۔
”آپ واقعی ذہین ترین آدمی ہیں۔ شیشہ اور کنگھی! کنگھی اور شیشہ کیا بات ہے واللہ!“

”اگر آپ ان دونوں پر ٹیکس لگا دیں چاہے معمولی سا تو کروڑوں کی آمدنی ہو سکتی ہے۔“

”کروڑوں؟ وارے نیارے ہو جائیں گے..... اچھا اب ایک منٹ کے لئے دماغ کو پھر آزمائش میں ڈالئے۔ اور سوچ کر بتائیے کہ کوئی ایسی چیز رہ تو نہیں گئی جس پر ہم نے ٹیکس نہیں لگایا۔ آپ بھی سوچئے۔ میں بھی سوچتا ہوں۔“

چند ثانیے ہم دونوں خاموش بیٹھے سوچتے رہے۔ معاً دزیرٹیکس نے کہا۔ ”ایک چیز کا تو مجھے پتہ چل گیا ہے۔ باقی آپ بتا دیجئے۔“
”وہ کونسی چیز ہے؟“

”برف!“



**THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM**

**LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.**

”برف؟“

”ہاں ہاں بھٹی برف! جانتے نہیں گرمی کے موسم میں ہر آدمی برف استعمال کرتا ہے“

”خوب! بہت خوب! میں نے وزیر ٹیکس کی ذہانت کی داد دیتے ہوئے کہا۔“

”اچھا اب آپ کہیے۔ آپ نے کیا سوچا ہے؟“

”میرے خیال میں تو ابھی بہت سی چیزیں باقی ہیں۔ مثال کے طور پر غراہ۔“

”آپ کا مطلب ہے ریشمی غراہ؟“

”ہاں!“

”اس پر ٹیکس نہیں لگایا جاسکتا۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ —————“ وزیر ٹیکس نے راز دارانہ لہجے میں کہا۔

”شریمتی جی پہنتی ہیں!“

”تو رہنے دیجئے ————— حنا کے متعلق کیا خیال ہے؟“

”حنا پر ٹیکس لگایا جاسکتا ہے۔ حنا سے شریمتی جی کو خاص طور پر نفرت ہے۔“

”خضاب؟“

”خضاب پر ٹیکس لگانا ٹھیک نہیں رہیگا۔ والد محترم خضاب لگانے

ہیں..... خضاب کے علاوہ کوئی اور چیز بتائیے!“
 ”عینک، چھتری، ہوا، چاقو، چمچ، دیگی، لحاف، رضائی، کتلیہ،
 تولیہ، جھومر، نتھہ۔ بازو بند، گھڑی، فونٹین، پین، ہلدی، مرچ، دار چینی
 گرم مصالحہ.....“

”بس بس کافی ہیں۔ میرے خیال میں ننانوے کردڑ کا خسارہ پورا
 ہو جائے گا۔“

”اگر اب بھی پورا نہ ہوا۔ تو پھر۔ دھوپ اور پانی پر بھی ٹکیں لگا
 دیجئے گا۔“

”نہیں نہیں۔ میرے خیال میں اس سال یہ نوبت نہیں آئیگی۔
 اگلے سال دیکھا جائیگا۔“

”اچھا تو اب مجھے اجازت ہے؟“
 ”بہت بہت شکریہ۔“ وزیر ٹکیں نے مجھ سے بغلیں ہوتے ہوئے
 فرمایا۔ ”آپ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ نہ صرف ذہین بلکہ
 ذہین ترین آدمی ہیں۔“

نیا شکنجہ !

پارلیمنٹ میں ایک نہایت اہم تقریر

مسٹر سپیکر ! پارلیمنٹ کا یہ غیر ضروری اجلاس ہے، اسے منعقد کرنے کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ ملک کی بدقسمتی سے انتخابات میں ہم نے بھاری اکثریت حاصل کر کے پارلیمنٹ میں ایسی مضبوط پارٹی بنالی ہے کہ ہم اقلیت کے معقول سے معقول مطالبے بھی رد کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ بہت دنوں سے کر رہے ہیں اور تھوڑے دن اور کر سکیں گے۔ اس غیر ضروری اجلاس میں غیر قانونی نقطے پیش کئے جائیں گے۔ ”قانونی“ کہنا بھی تکلف ہے۔ ورنہ وہ نقطے ایسے ہیں کہ ان کا کسی قانون سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ نقطے کسی ایسی پارلیمنٹ میں پیش کئے جاتے جس کے افراد

ذی ہوش اور سمجھ والا انسان ہوتے تو شاید وہلی کی بجائے مجھے آگرہ میں
منتقل کر دیا جاتا۔ تاکہ اپنے دماغی توازن خیر خدا کا لاکھ لاکھ
شکر ہے کہ اس ہاؤس میں ایسا کوئی خطرہ نہیں۔

ہاؤس کو یاد ہوگا۔ آخر ہاؤس کا حافظہ اتنا کمزور نہیں اور اگر کمزور ہو تو مجھے بخوبی
یاد ہے۔ ہاؤس کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہاؤس
کو یاد ہوگا کہ چند سال میرا مطلب ہے چند مہینے ہوئے۔ ہم نے ملک کے لئے
ایک "نیا آئین" تیار کیا تھا۔ اس آئین کا ملک کے بے سمجھ حلقوں میں کافی
خیر مقدم کیا گیا۔ چند غیر ممالک نے بھی اس کی بہت تعریف کی۔ یہ غیر ممالک
وہ تھے جن کے آئین سے ہم نے کافی حقے حرت بحرت نقل کر لئے تھے۔
مجھے افسوس ہے کہ یہ آئین مرتب کرتے وقت جلد بازی سے کام لیا گیا۔
ہاؤس کو یاد ہوگا کہ ہم نے اسے مرتب کرنے کے لئے محض نین سال کا مختصر
عرصہ صرف کیا تھا۔ اس قلیل عرصے میں ایک معیاری آئین مرتب کرنا
ناممکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں کافی نقائص رہ گئے۔ ہم نے فیصلہ
کیا تھا کہ اس آئین میں وقت بے وقت تبدیلیاں کرتے رہیں گے تاکہ چند
صدیوں کے بعد یہ ایک معیاری آئین بن جائے۔

آج کے اجلاس میں ایک ترمیم پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں جرأت
کا لفظ میں نے غلطی سے استعمال کیا ہے۔ دراصل جرأت کی بجائے "ڈھٹائی"
زیادہ بر محل ہوگا۔

مسٹر سپیکر! میں آپ کی اجازت سے تجویز کرتا ہوں کہ اس نئی ترمیم

کا نام نیا شکجہ رکھا جائے۔ (گورنمنٹ بچوں سے تالیاں اور اپوزیشن سے شیم شیم کی آوازیں) میں سمجھتا ہوں۔ اور میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ماؤس بھی یہی سمجھتا ہے کہ کوئی بھی ترمیم۔ ترمیم کم اور شکجہ زیادہ ہونی چاہیے۔ حضرات! آپ نے تالی نہیں بجائی۔ حالانکہ تالی بجانے کا یہ نادر موقعہ تھا۔ بات یہ ہے.....

مسٹر سپیکر! کہ اس شکجے کی عدم موجودگی میں گورنمنٹ کو بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ سب سے بڑی مشکل تو یہی ہے کہ گو ہم کافی لوگوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ تاہم بہت سے ایسے لوگ ہیں جو گرفتار ہونے سے بچ گئے ہیں۔ جب تک وہ کسی جرم کا ارتکاب نہ کریں۔ گورنمنٹ انہیں گرفتار کرنے سے معذور ہے۔ لیکن مسٹر سپیکر! آخر گورنمنٹ کب تک انتظار کر سکتی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جرم نہ کرے تو اُسے گرفتار ہی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ عجب اندھیر ہے یعنی گورنمنٹ تمام عرصہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی رہے۔ کہ کب کوئی شخص جرم کرتا ہے۔ میں ماؤس سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ گورنمنٹ کی بے بسی ملاحظہ فرمائے۔ اور اس کے بعد فیصلہ کرے کہ آیا گورنمنٹ نیا شکجہ مرتب کرنے میں حق بجانب ہے یا نہیں۔ (اپوزیشن بالکل نہیں۔ بالکل نہیں) مسٹر سپیکر! آپ اپوزیشن سے خاموش رہنے کے لئے کہیے۔ کیونکہ اب میں مختصراً اس نئے شکجے کی تشریح کرنا چاہتا ہوں۔

نئے شکنجے کی دفعہ عا کی رد سے کسی شخص کو سچ بولنے کہنے یا لکھنے

کی اجازت نہ ہوگی۔

(توضیح) کانے کو کانہ۔ اندھے کو اندھا۔ بہرے کو بہرا۔ قحط کو قحط۔

بد انتظامی کو بد انتظامی۔ رشرت کو رشوت۔ ٹیکس کو ٹیکس۔ چور بازاری کو چور بازاری کہنا سچ ہے۔ جو شخص بولنے۔ کہنے یا لکھنے کا مرتکب ہوگا اسے فوراً نظر بند کر دیا جائے گا۔ اگر وہ لیکھک ہے تو اس کا قلم توڑ دیا جائیگا۔ اور دوات ضبط کر لی جائے گی۔ اگر وہ سیاست دان ہے تو اسے غدار کا لقب دے کر بدنام کیا جائیگا۔ اگر وہ مقرر ہے تو اس کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی۔

مسٹر سپیکر! میرے خیال میں یہ سزائیں کافی عبرت ناک ثابت ہوں گی۔ بین الاقوامی حالات بھی کچھ ایسے ہیں کہ ہم ان سے زیادہ سخت سزائیں نہیں دے سکتے۔ ورنہ میرا تو خیال ہے کہ ایسے اشخاص کو زندہ جلا دیا جائے۔ تاکہ وہ سچ بولنے کی شرمناک عادت سے توبہ کریں۔

نئے شکنجے کی دفعہ عا کی رد سے ہر اس شخص کو گرفتار کیا جائے گا۔ جس نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ لیکن جس سے جرم کرنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ حضرات! توقع کا لفظ غور طلب ہے۔ جرم کرنے کی توقع ہر شخص سے کہ جو ہماری پارٹی کا ممبر نہیں ہے۔ کی جاسکتی ہے۔ صرف ہماری پارٹی ہی ایسی ہے جو جرائم کا ارتکاب کرتی ہوئی بھی جرائم کا ارتکاب نہیں کرتی۔ باقی سب پارٹیاں ایسی ہیں کہ ان کے افراد سے پہلے کی کسی تاریخ اور دن کے کوئی وقت بھی جرم کسی

پھر چھوٹے بڑے ادیب ہوتے ہیں۔ چھوٹے ادیب کمپور کی دلچسپ باتیں سننے کے لئے آتے ہیں۔ بڑے ادیب چالو ادبی سیاست گری پر اس سے بحث کرنے کے لئے آتے ہیں۔ رسائل کے ایڈیٹر آتے ہیں جو اپنے پرانے سالناموں کی ہیبت کا رعب جھاکر اس سے مضمون کا وعدہ مانگنے آتے ہیں۔ ادبی کتابوں کے ناشر آتے ہیں۔ جو کمپور کی تعریفوں کے پل باندھ کر بغیر اٹلیٹی کے اس سے کتاب کا مسودہ لے جاتے ہیں۔ محلے کے کلرک آتے ہیں۔ جو اس کے ساتھ کانگریس مسلم لیگ اور راشٹریہ سنگھ کی سرگرمیوں پر بحث کرنے لگ جاتے ہیں۔ فلم پر ڈیوسر آتے ہیں جو اسے کلکتے اور بمبئی کے طلسم زار میں لے جانا چاہتے ہیں۔ اور چند ایک رشتہ دار آتے ہیں جو کمپور کو اس درجہ مصروف دیکھ کر کف افسوس ملتے ہیں کہ وہ اپنے گھر بار کا مطلق خیال نہیں کرتا۔ اور بے معنی اور بے فائدہ باتوں میں گھیر کر بگڑ گیا ہے۔

کمپور ان سب آنے والوں کا ایک معنی خیز تبسم سے استقبال کرتا ہے۔ صوفے پر سے ندرے اچھلنے کی سی کیفیت میں اٹھتا ہے۔ پھر انہیں سگریٹ پیش کرتا ہے، چائے پلاتا ہے، ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے، نہایت شگفتہ اور محبوب لہجے میں ان سب کے مسائل کو چٹکیوں میں حل بھی کرتا ہے۔ اور وہ سب ہی یہ خیال لے کر چلے جاتے ہیں کہ کمپور ایک نہایت مخلص آدمی ہے۔ نہایت گریٹ آدمی ہے۔ نہایت معقول آدمی ہے۔ اس کی باتیں خاص پیچیدہ نہیں ہوتیں۔ نہ ان میں عالمانہ رنگ

نئے شکنجے کی دفعہ ۳ کی رو سے گورنمنٹ کو ہر اس شخص کو گرفتار کرنے کا حق ہوگا۔ جس سے گورنمنٹ کو خواہ مخواہ ڈر لگتا رہتا ہے۔ مسٹر سپیکر! آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ملک میں ایسے لوگوں کی بھاری تعداد موجود ہے۔ جن کے محض تصور سے گورنمنٹ لرزہ برزنا شروع ہو جاتی ہے۔ میں ہاؤس کو یقین دلانا ہوں کہ یہ اشخاص اکثر میرے خوابوں میں آکر مجھے ڈرانے رہتے ہیں۔ پرسوں رات تو مجھے اتنا ڈر لگا کہ مارفیا کے ڈبل انجکشن کے باوجود نیند نہیں آئی۔ میں ہاؤس سے پوچھتا ہوں۔ ان لوگوں کو کیا حق ہے کہ وہ ہماری نیندیں حرام کر دیں۔ کبھی فلک شگاف نعرے لگا کر۔ کبھی لال لال جھنڈے دکھا کر۔ کبھی ہمارے قریب کی قلعی کھول کر۔ کبھی ہماری جہالت پر طنز کر کے۔ کبھی ہماری بیہودگیوں کا مذاق اڑا کر۔ میں سچ کہتا ہوں۔ ان لوگوں نے ہمارے اعصاب کا جو حال کر رکھا ہے وہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ تو مسٹر سپیکر! آپ کی اجازت سے میں ہاؤس کو بتانا چاہتا ہوں کہ جب تک ایسے لوگ جیل کی کوٹھڑیوں میں بند نہیں کئے جائیں گے۔ کم از کم میں آرام سے نہیں سو سکوں گا۔ حضرات کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ آپ کا محبوب لیڈر ساری ساری رات ڈر کے مارے سو نہ سکے۔ اور یہ لوگ اسے ڈرا ڈرا کر ادھموا کر دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہاؤس میں کوئی سنگدل انسان نہیں جو یہ چاہتا ہو۔

مسٹر سپیکر! آخر میں صرف اتنا عرض کرنا باقی ہے کہ ہم نے جو بنیائیں بنایا تھا۔ وہ بالکل لغو اور فضول تھا۔ ہاؤس کو یاد ہوگا کہ اس آئین

ہم نے ہر شخص کی آزادی تقریر و تحریر کا حق دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں۔ یہ ہماری غلطی تھی۔ ہم اس کے لئے نادم ہیں۔ ہم نہایت عاجزی سے مرحوم بالو کی رُوح سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اس غلطی کے لئے معاف کر دیں۔ اگر وہ نہ بھی معاف کریں تو چنداں مضائقہ نہیں کیونکہ مرحوم اب دہاں پہنچ گئے ہیں۔ جہاں سے وہ صرف ہماری حرکتوں پر لا حول و پُر ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔

خاموشی نغمے!

یوں تو مدت سے سن رکھا تھا کہ خاموشی معضہ وارد کہ گفتگو
 نئے آید۔ لیکن اس مثل کی صداقت کا علم کچھ اس دن ہوا۔ جب ایک دوست
 ہندوستانی ڈانسر کا ناچ دیکھنے لے گئے۔ ہم نے سمجھا تھا کہ وہ اوجھل
 دے بالموں "قتم" کا کوئی نئی ناچ ہوگا۔ لیکن ہل میں پہنچ کر معلوم ہوا۔
 کہ یہ خالص استادی ناچ ہے۔ ڈانسر صاحب ایسا عجیب و غریب حلیہ
 بنا کر سٹیج پر تشریف لائے کہ ایک وقفہ تو دیکھ کر بھونچکا سا رہ گئے۔ ان
 کے ساتھ شاید ان کی اہلیہ محترمہ بھی تھیں۔ اب جو دونوں نے سٹیج پر اچھلتا
 کودنا شروع کیا۔ تو پہلے تو ہم یہی سمجھے۔ کہ شاید ناچ شروع کرنے سے پہلے
 مددش کر رہے ہیں۔ جب ہاتھ پاؤں کھل جاتیں گے تو ناچ شروع کرینگے۔
 لیکن جب انہوں نے منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر یہ عمل پندرہ بیس منٹ

جاری رکھا۔ تو ہم بہت گھبرائے۔ وہ انگلیوں اور آنکھوں سے ایسے ایسے عجیب اشارے کر رہے تھے۔ کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ کیا کہہ رہے ہیں یا کہنا چاہتے ہیں۔ ادھر ڈانسر صاحب نے آنکھ مٹکائی اور ادھر ان کی اہلیہ محترمہ کچے تاگے میں بندھی آئی گی سرکار مری کی مجسم تصویر بنی ان کے پاس پہنچ گئیں۔ وہ عجیب و غریب زاد یہ بناتے ہوئے ابرو کو جنبش میں لائے اور وہ جھٹ چھلانگ لگا کر ان سے علیحدہ ہو گئیں۔ دونوں اپنی انگلیاں کچھ اس انداز سے توڑ مروڑ اور گھما رہے تھے کہ ہر لمحہ ڈر لگتا تھا کہ کہیں انہیں موج آگئی۔ تو پھر کیا ہوگا۔ اس ناچ کا کلاٹیکس (CLIMAX) کچھ اس طرح ہوا۔ ایک دم ڈانسر صاحب زور سے سیٹج پر اچھلے اور اگر سیٹج واقعی مضبوط نہ ہوتی تو ضرور زمین پر آ رہتے۔ ادھر ان کی اہلیہ محترمہ ان کی جانب شعلے کی طرح لپکیں۔ ڈانسر صاحب نے انہیں گود میں لینے کی کوشش کی۔ مگر وہ پینترا بدل کر صاف انہیں چکمہ دے گئیں اور سیٹج کی دوسری جانب پہنچ گئیں۔ حاضرین ڈانسر صاحب سے ہمدردی جتانے کی بجائے تالیاں پیٹنے لگے۔ ہم دل ہی دل میں حیران ہونے لگے کہ یا الہی! یہ ماجرا کیا ہے۔

ڈانس کے اختتام پر ہمارے دوست نے ہمیں بتایا کہ ”یہ کتھاکلی“ تھا۔ اس وقت تو ہم اُسے انارکلی کی خالہ زاد بہن سمجھے۔ لیکن گھر لوٹتے وقت راستے میں ہمارے رفیق نے کتھاکلی کی تشریح فرماتے ہوئے بتایا کہ بیشتر استاد ی ناچ خاموشی کی زبان سے ادا کئے جاتے ہیں۔ خاموشی کی

بھی زبان ہوتی ہے کیا؟“ ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔
 ”کیوں نہیں؟“ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”وہ سنا نہیں آپ
 نے جان کیٹس کا مشہور قول۔“ خاموش فغھے عام نغموں سے شیریں ہوتے
 ہیں۔“

اُس دن سے ہم خاموشی کی گفتگو کے قائل ہو گئے۔ شاید اتنی جلدی
 نہ بھی ہوتے۔ اگر ایک اور واقعہ پیش نہ آتا۔ ایک صاحب کہ کسی زمانے
 میں ہمارے ہم جماعت تھے مگر سلسلہ تعلیم منقطع کر کے یوگی ہو گئے تھے۔
 مدت کے بعد ہمارے ہاں تشریف لائے۔ ایک دن ہم انہیں سیر کے لئے
 لے گئے۔ چلتے چلتے ایک صحرا میں جانکلے۔ شام کا وقت تھا اور ہوا کا عالم۔
 نہ جلنے کی یوگی صاحب کے جی میں کیا آئی۔ کہ اچھل کر ایک ٹیلے پر جا بیٹھے۔
 اور آنکھیں بند کر کے سادھی کے عالم میں جا پہنچے۔ ادھر ہم انتظار
 کرنے لگے۔ کہ کب آنکھیں کھولتے ہیں۔ اور گھر چلتے ہیں۔ ادھر وہ اس
 طرح ڈٹ کر بیٹھے ہوئے تھے جیسے اب باقی عمر اسی ٹیلے پر بسر کریں گے۔
 خدا خدا کر کے کوئی پون گھنٹے کے بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ ہونٹوں
 پر ایک صوفیانہ مسکراہٹ لاتے ہوئے فرمایا۔ ”آہ! خوب آندہ
 آیا آج تو“ میں نے پوچھا۔ ”آپ کا مطلب ہے ٹیلے پر بیٹھ کر“ فرمانے
 لگے۔ ”نہیں۔“

”تو پھر“
 ”خاموشی کا دلکش نغمہ سن کر“

”خاموشی کا نغمہ ہے ہمیں تو بالکل سنائی نہیں دیا“
 ”سنائی کیسے دیتا۔ وہ تو صرف روح کی گہرائیوں میں گونجتا ہے۔ اُسے
 سننے کے لئے روحانی کانوں کی ضرورت ہوتی ہے“
 یوگی صاحب کی بات کا ہم پر کافی اثر ہوا۔ اور ہم خاموشی کو سننے
 کی باتا عدہ مشق کرنے لگے۔ تھوڑی سی مشق کے بعد محسوس ہونے لگا کہ
 یوگی صاحب بجا فرماتے تھے۔ خاموشی جتنے کہ ایسی خاموشی جس کا ذکر کسی
 ستم ظریف نے حفیظ جالندھری کی نظم ”چاند کی سیر“ پر پیر وڈی لکھتے ہوئے
 ان الفاظ میں کیا ہے :-

اک براہمن خموش
 پاس اُس کی زن خموش
 گن رہے تھے دھن خموش
 لڑکے لڑکیاں خموش
 مٹکے مٹکیاں خموش
 میں یہ نشان کروکار

دیکھتا چلا گیا

ایسی خاموشی بھی کچھ نہ کچھ کہتے سنائی دیتی ہے۔ آپ شاید کہیں گے ہم
 مبالغے سے کام لے رہے ہیں۔ بالکل نہیں۔ اگر خاموشی باتیں نہ کر سکتی۔ تو
 فانی بدایونی اتنے وثوق سے اپنی وفات حسرت آیات کے بعد اپنی محبوبہ
 سے نہ کہتے تھے

مٹے جاتے نہ تھے تم سے مرے ن رات کے شکوے

کفن سرکاڈ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ!

خیال فرمائیے۔ شاعر کفن میں لپٹا ہوا پڑا ہے۔ محبوبہ اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ بظاہر دونوں خاموش ہیں۔ لیکن ان دونوں کی خاموشی کیا کچھ نہیں کہہ رہی۔ بقول یوگی صاحب ذرا اپنے روحانی کانوں سے سننے کی کوشش کیجئے۔ شاعر کی خاموشی پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ ”لیجئے صاحب۔ آپ ہم سے ہمیشہ غبار ہے۔ کہ ہم آپ کی جھاؤں کا ذکر کر کے آپ کو شرمندہ کیا کرتے تھے۔“

”آج ہم بالکل خاموش ہو گئے۔ کیئے اب تو آپ خوش ہیں۔“ اور محبوبہ کی خاموشی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتی ہے۔ ”افسوس! آپ بہت جلد بانٹکے۔ ہم نے مانا کہ آپ کے شکووں سے کافی تنگ آ گئے تھے کہ ان میں بیشتر بے معنی ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ آپ خود کشتی کر لیں اور ہمیں اس لطف سے محروم کر دیں۔ ہو گا ہے گا ہے آپ کے شکوے سن کر آتا تھا۔“

نیر یہ تو بہت بخیدہ خاموشی تھی۔ جس کی گفتگو سننے کی شاید یہ تپاب نہ لاسکے ہوں۔ آئیے! آپ کو ایک ایسی خاموشی کی گفتگو سنائیں۔ جس کے ساتھ شاید آپ کا بھی واسطہ پڑا ہو۔

باپو صاحب خلاف معمول گھر نہیں لوٹے۔ شرمیٹی جی دل ہی دل میں چیخ و تاب کھا رہی ہیں۔ دس۔ ساڑھے دس۔ گیارہ۔ بارہ۔ ساڑھے بارہ بجے

بابو صاحب تشریف لائے شرمیتی جی کا چہرہ دیکھتے ہی بھانپ لیا کہ ”تن کے بیٹھے ہیں۔“ باریک سی آواز میں کھانا طلب کیا۔ انہوں نے بڑی بے رخی سے پیش کیا۔ بابو جی نے ایک آدھ بار سوچا کہ سالن کی تعریف کر کے شرمیتی جی کے پارے کو نیچے لے آئیں۔ پھر سوچا۔ یہ سنا ہتھیار بے سود ثابت ہوگا۔ چپ رہے۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں بیٹھنے کے کمرے میں آ گئے۔ شرمیتی جی سویٹر بننے لگیں۔ بابو صاحب اخبار پڑھنے لگے۔ لیکن نہ اُن کا دل سویٹر بننے میں لگ رہا ہے۔ نہ ان کا اخبار میں۔ دونوں خاموش ہیں۔ لیکن دراصل دونوں کچھ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ بابو صاحب۔ ذرا ذرا سی بات پر شک کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ یہ ٹھیک ہے میں مس لیلا کے ہی گھر سے آ رہا ہوں۔ لیکن اُس کے گھر جانا جرم ہے نہ گناہ۔ آخر ہوا کیا جو میں دیر سے لڑا۔ لیکن جب دلچسپ باتیں ہو رہی ہوں۔ وقت کا کسے خیال رہ سکتا ہے۔ بس آپ اس پر تمل لارہی ہیں ؟

شرمیتی جی۔ ”میں آپ کا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہوں میں لیلا خوبصورت ہے۔ آپ اسے اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ دلچسپ جھوٹ بول سکتی ہے۔ جب سے اُس نے آپ کی تحریروں میں دلچسپی کا اظہار کیا ہے آپ اس کے علاوہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اگر وہ آپ کو اس قدر پسند ہے۔ تو آپ نے مجھ سے شادی ہی کیوں کی۔“

بابو صاحب کی خاموشی جواب اب جواب عرض کرتی ہے ”عجیب مصیبت

ہے یہ شادی بھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیوی کے علاوہ کسی سے بات تک نہ کرو۔ مس لیڈا کچھ بھی ہو۔ نوہین لڑکی ہے۔ جب میں اسے اشعار سناتا ہوں۔ انہیں سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ آپ کی طرح یہ نہیں کہتی۔ شعر تو ہوتے رہیں گے۔ پہلے بازار جا کر بینک لے آئیے۔“

آئیے اب ذرا آپ کو شہر کے سب سے بڑے باغ میں لے چلیں۔ وہ دیکھتے ایک بیچ پر ایک نوجوان چپ چاپ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا چہرہ آداس۔ رنگ زرد اور چشم پر غم ہے۔ پتھر کے بُت کی طرح وہ ساکن اور خاموش ہے۔ شاید وہ ناکام عاشق ہے۔ فیل شدہ طالب علم ہے۔ یا مظلوم خاوند ہے۔ بھلا سنیے تو اس کی خاموشی کیا کہہ رہی ہے۔ آپ نہیں سن سکتے۔ تھوڑی سی اور کوشش کیجئے۔ سنا آپ نے؟ اس کی خاموشی بار بار صرف ایک شعر گنگنا رہی ہے۔

تخلیق کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا ہوگا آپ بھی نیرواں کبھی!

لیجئے آپ کے دیکھتے دیکھتے وہ نوجوان ایک ادھیڑ عمر کے آدمی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کے چہرے پر متعدد جھریاں ابھرتی ہیں۔ بال اچانک کچھڑی ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ بدستور خاموش ہے۔ اب وہ یہ کہتے ہوئے سناتی دیتا ہے ”عجیب تقاضے ہیں ہونے والے دامادوں کے۔ پندرہ ہزار جہیز ہیں۔ میرے پر ماتا! پندرہ ہزار کوئی کہاں سے لائے۔ کیا بھلے تھے وہ دن جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ نہ غیر معقول جہیز کا مطالبہ نہ کوئی

اور بدعت۔ پندرہ ہزار کا انتظام کیسے ہوگا۔ قرض ۶ ڈاکہ ۶ امانت میں
خیانت ۶ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ نہیں آتی۔ نہیں آتی۔

اور اگر آپ غور سے دیکھیں تو شام کے دھندلکے میں یہ اُدھیر
عمر کا آدمی بہت ضعیف نظر آنے لگا ہے۔ شاید وہ سال خوردہ لیڈر ہے۔
جو گم سم بیٹھا ماضی کی راکھ میں سے چنگاریاں چُن رہا ہے۔ کبھی وہ خاموش
فلسفی نظر آتا ہے جو حیات و ممات کے جھگڑے چکار رہا ہے۔ کبھی وہ خاموش
شاعر ہے جو خالق کون و مکان سے الجھ رہا ہے۔ کبھی وہ یاؤس قنوطی ہے۔
جسے ہر مسکراہٹ پر آنسو اور ہر بہار پر خزاں کا گمان ہوتا ہے۔ اور کبھی
یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاموش مفکر ہے۔ جو بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے
والوں سے کہتا ہے

کہہ رہا ہے شور و دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا خبناظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

ہوتا ہے۔ اور نہ ان سے کسی ذہنی گہرائی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جب
 وہ بے ساختہ تسلسل کے ساتھ باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ جب ہر دوسرے
 تیسرے فقرے پر وہ ایک بچے تنکے قہقہے کے ساتھ ملاقاتی کے ہاتھ
 پر ہاتھ مارتا ہے۔ داد کی تانی بجاتا ہے۔ اس کے کندھوں پر پٹیہ پر
 زانو پر ہاتھ مارتا ہے۔ تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بہت بڑی بات
 کہی گئی ہے۔ لیکن اس کہی جانے والی بڑی بات کی پوری شدت اس
 لمحے بالکل محسوس نہیں ہوتی۔ اور بسا اوقات تو حیرت بھی ہوتی ہے۔
 کہ کیوں نے کوئی خاص اہم اور عظیم بات تو کہی نہیں۔ پھر یہ کامیڈی
 یہ قہقہہ کیوں؟ یہ ہاتھ پر ہاتھ مارنا کیسا؟ مگر آپ کیوں سے جدا ہو
 جائے۔ تو دو تین گھنٹے کے بعد آپ اپنے اندر اس قہقہے کا اثر محسوس
 کریں گے۔ اور اس شدت کے ساتھ چونک پڑیں گے۔ جیسے واقعی کسی
 بہت بڑی بات پر چونکا جاسکتا ہے۔ بس یہی کیوں کی باتوں کا طلسمی
 پہلو ہے۔ اتنے لالہ بالیانہ پن سے اتنی بے نیازی سے باتیں کرے گا۔
 جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جیسے کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ دنیا کے بڑے سے
 بڑے حادثے کو اپنے انداز بیان کی بے پروائی سے یوں بے معنی
 اور بے اثر بنا کر رکھ دے گا۔ اور آپ کے ذہن پر پڑے ہوئے
 بوجھ کیوں ٹل جانے کا اشارہ دے گا۔ کہ ایک بار تو دماغ پر ایک
 لطیف قسم کا غبار چھا جائے گا۔ لیکن جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، کیوں
 سے جدا ہونے کے بعد آپ سوچیں گے۔ کہ کیوں کا قہقہہ بے پناہ معنی پیدا

حماقت

جب کالج میں پڑھتے تھے اور دوستوں اور رشتہ داروں کی ازدواجی زندگی کو قریب سے دیکھتے تھے تو سوچا کرتے تھے کہ زندگی میں بڑی سے بڑی حماقت کرینگے لیکن شادی نہیں کریں گے۔ یہ خیال اور بھی مستحکم ہو جاتا۔ جب آٹھ دن بڑے بھائی صاحب اور بھادج میں نوک جھونک سننے کا موقع ملتا۔ آج بھادج اس لئے ناراض ہیں کہ بھائی صاحب پانچ بجے کی بجائے سات بجے دفتر سے واپس آئے آج اس لئے بگڑ رہی ہیں کہ وہ اکیلے سینما دیکھنے کیوں گئے تھے۔ اور کبھی اس بات پر ہنستا ہوا کہ وہ عورتوں کو مردوں کی بہ نسبت بیوقوف سمجھتے ہیں۔

جب کبھی بھادج اپنی سپیلیوں کے ساتھ کسی جلسے میں شرکت کرنے جاوے اور مینے کو سنبھالنے کا فرض بھائی صاحب کے ذمہ ہوتا۔ اس وقت

ان کی حالت نہایت قابل رحم ہوتی۔ مُتاہے کہ بے تحاشا چلائے جا رہا ہے۔ وہ اُسے چپ کرانے کے لئے لاکھ جتن کر رہے ہیں۔ مگر مُتا کجنت مانتا ہی نہیں۔ ”مُتے وہ دیکھو۔ وہ طوطا۔ کتنا اچھا طوطا ہے ہنا مُتے؟ دیکھو اس کی چونچ کتنی اچھی ہے۔۔۔۔۔۔ اچھا بابا اچھا۔ طوطا پسند نہیں۔ وہ چڑیا دیکھو کتنی خوبصورت ہے۔ چوں چوں کرتی ہے۔ کرتی ہے نا؟ کتنی اچھی چڑیا ہے۔ چھوٹی سی۔ چوں چوں کرتی ہے۔ چوں۔ چوں۔ چوں! دیکھو مُتے دیکھو!“

لیکن مُتا نہ طوطے کی طرف دیکھتا نہ چڑیا کی طرف بلکہ منہ بنائے لگتا۔ روٹے چلا جاتا۔ حتیٰ کہ بھائی صاحب کو غصہ آ جاتا اور وہ چیخ کر کہتے۔ چپ بھی کہ شیطان۔ کرتا ہے یا نہیں؟ لگاؤں ایک تھپڑ! تھپڑ کا نام سنتے ہی مُتا اتنے زور سے رونے لگتا۔ جیسے بیک وقت اسے کئی بھڑوں نے کاٹ کھایا ہو ایسا۔ اس قسم کے مناظر دیکھ کر ہم دُعا مانگا کرتے تھے کہ خدا شادی سے ہر شخص کو محفوظ رکھے۔

ایم اے کرنے کے بعد کالج میں ملازمت مل گئی تھی۔ کوچہ بلی ماراں کے نمکڑ پر ایک چھوٹا سا کمرہ کرایے پر رہے رکھا تھا۔ جس میں ایک مچولی درجے کا صوف تھا۔ دو تین کرسیاں چند دلچسپ کتابیں۔ ایک پالتو کتا۔ اور ایک دانکن۔ پڑھتے پڑھتے اکتا گئے۔ تو کتے سے کھیلنے لگے کتے کی شرارتوں سے تنگ آ گئے۔ تو دانکن بجانا شروع کر دیا۔ کھانا ایک متوسط درجے کے ہوٹل سے کھاتے تھے۔ اور ہر چند کہ کھانا اس قسم کا

ہوتا تھا کہ بسا اوقات محسوس ہوا جیسے ہم کھانے کو نہیں کھانا ہمیں
 کھائے جا رہا ہے۔ پھر بھی خدا کا شکر بجالانے لگے تھے کہ اس کھانے سے
 بہتر ہے جو ہزاروں بیویاں اپنے خاوندوں کو آٹے دن کھلاتی ہیں۔
 بڑے آرام سے زندگی گذر رہی تھی۔ مگر وہ جو کسی نے کہہ لیا کہ
 چرخِ کج رفتاری کو چپین سے نہیں رہنے دیتا۔ وہی معاملہ ہوا۔ ہمارے
 خاندان میں ایک بزرگ تھے۔ جنہیں ہر کونالے آدمی سے چڑھتی سان
 کا تکیہ کلام تھا ”اکیلے آدمی کی بھی کیا زندگی ہے“۔ عقیدہ ان کا یہ تھا۔
 کہ اگر انسان دو تین شادیاں نہ کر سکے۔ تو کم از کم ایک تو ضرور کرے۔
 یہ بزرگ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے۔ وقت بے وقت انہوں
 نے ہمیں یہ ذہن نشین کرانا شروع کر دیا۔ کہ شادی نہ کر کے ہم ایک
 گناہِ عظیم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ جب سمجھی ملے کسی فلسفی یا بہر کچر
 کا حوالہ دے کر فرمانے ”حکیم چن چان چون نے لکھا ہے کہ جو شخص
 شادی نہیں کرتا وہ فرشتہ ہے یا پاگل۔ امریکہ کے ایک ماہر نفسیات
 کا کہنا ہے کہ وہ شخص زندگی میں کبھی باپ نہیں کہلا سکتا۔ جس نے شادی
 نہیں کی“

ہم تنانت سے عرض کرتے کہ بہر حال ہمارا شادی کرنے کا کوئی
 ارادہ نہیں کیونکہ ہم شادی کو اچھی خاصی مصیبت سمجھتے ہیں۔ ہفتہ عشرہ
 کے بعد بزرگ سے پھر ملاقات ہوئی۔ اور وہ چھوٹے ہی پھر شادی کا
 ذکر پھیر دیتے ”میرے ایک دوست ریٹائرڈ مجسٹریٹ ہیں۔ ان کی

صاحبزادی ایم لے ہیں۔ نہایت شریف لڑکی ہے۔ رنگ و راسا نولا ہے لیکن جہیز معقول ملے گا۔“

میرے ایک دوست کے دوست ٹھیکیدار ہیں۔ ان کی بیٹی بی لے بی ٹی ہیں۔ گورنمنٹ سکول میں پڑھاتی ہیں۔ گانا جانتی ہیں لیکن ناچنا نہیں۔ پاؤں میں نقص ہے۔ جہیز میں کم از کم بیس ہزار۔ ہم ان کی بات کاٹ کر کہتے۔ ”ہمیں بیوی کی ضرورت ہے نہ جہیز کی۔ آپ سسی اور سے بات کر لیجئے۔“ بزرگ برابر فرماتے جاتے۔ ”آپ کو دونوں کی ضرورت ہے۔ لیکن خدا جانے آپ کی عقل پر کیوں پردہ پڑ گیا ہے۔ کہ آپ ایک کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔“

ایک دن ہم بیمار پڑ گئے۔ بزرگ تیمارداری کو آئے۔ اس دن انہوں نے شادی کی ضرورت پر کچھ اتنے موثر انداز میں لکچر دیا کہ ہمیں ان پر ایمان لانا ہی پڑا۔ کہنے لگے ”دیکھا۔ یہ حال ہوتا ہے غیر شادی شدہ کا۔ درو سے گمراہ رہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ خدا نخواستہ اگر یونہی لیٹے لیٹے آپ پر نزع کی حالت طاری ہو جائے۔ ہمارا مطلب ہے اگر ایک نخت دل کی حرکت بند ہو جائے۔ تو آپ وصیت بھی نہ کر سکیں گے۔ بیوی پاس ہوتی۔ کم از کم آپ کی وصیت تو لکھ لیتی۔ سچ کہا ہے حکیم قل فل دراز نے ”اکیلے آدمی کی بھی کیا زندگی ہے۔“ ذرا اپنے کمرے کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔ کتابیں بے ترتیبی سے بکھری پڑی ہیں۔ تکیے کا غلاف حد سے زیادہ میلا ہے۔ کرسیاں گرو سے اٹی پڑی ہیں۔

فرش کا بُرا حال ہے۔ بیوی ہوتی تو بخدا اس گھر کا نقشہ ہی دُوسرا ہوتا۔
 دو پختے بیمار لہنے کے بعد جب تندرست ہوئے۔ تو ہم واقعی اس
 کرنے لگے کہ اکیلے آدمی کی زندگی کوئی زندگی نہیں۔ چنانچہ اب جو بزرگ
 سے ملاقات ہوئی۔ اور انہوں نے حسبِ معمول کہا۔ ”میرے ایک دوست
 ریٹائرڈ میڈیکل ماسٹر ہیں۔ ان کی لڑکی ایف۔ اے فیل ہے۔ بڑی ذہین
 لڑکی ہے۔ قد ذرا.....“

تو ہم نے فوراً کہا۔ ”قطع کلام معاف! ہمیں منظور ہے۔“
 بزرگ نے کرسی میں اُچھلتے ہوئے فرمایا۔ ”بخدا زندگی میں پہلی بار
 تم نے عقل سے کام لیا ہے۔“

شادی ہو گئی اور گھر کا نقشہ بدلا جانے لگا۔ پرانے صوفے کی جگہ
 چیمبریں آئے ہوئے نئے صوفے نے لے لی۔ ٹوٹی ہوئی کرسیاں نیلام
 گھر بھجوا دی گئیں۔ آتشدان پر پہلی بار گلہ تے رکھے گئے۔ ردی کے ڈھیر
 باہر پھینکوائے گئے۔ فرش کو مل کر دھویا گیا۔ غرضیکہ درودیو کی سورت
 بدل ڈالی گئی۔ اس نئے ماحول میں مسرت اور سکون کا ملا جلا ایسا دلکش
 احساس تھا۔ کہ ہمیں اپنے پریشک آنے لگا۔ شروع شروع میں شرمیلی جی
 اس سلیقے اور شرافت سے پیش آئیں کہ آدرش ہندو بیویوں کی یاد تازہ
 ہو گئی۔ اگر نہانے کے لئے پانی طلب کیا تو فوراً گرم پانی مہیا کیا گیا۔ اگر صرف
 چائے کا مطالبہ کیا تو چائے اور ٹوسٹ حاضر کئے گئے۔ اگر پاؤں دبانے
 کو کہا۔ تو وہ پاؤں کے ساتھ سر بھی دبانے لگیں مگر جوں جوں وقت گزرتا

گیا۔ معلوم ہوا کہ شرمیتی جی وہ نہیں ہیں جو نظر آتی ہیں۔ تین چار ماہ کے بعد محسوس ہوا کہ

زمانے کے انداز بدلے گئے

نیا دور ہے ساز بدلے گئے

شرمیتی جی بات بات پر سچ پتا ہونے لگیں۔ ایک دن صبح کے وقت ہم وائلن بجارہے تھے کہ انہوں نے ساتھ والے کمرے سے چلا کر کہا۔ ”بندر بھی کیجئے۔ یہ ٹروں ٹروں سنتے سنتے کان بھی پک گئے۔“ ہم نے عرض کیا۔ ”یہ ٹروں ٹروں نہیں۔ بھیرویں کا الاپ ہو رہا ہے۔“ وہ ہمارے قریب آ کر بولیں۔ ”ہوگا بھیرویں کا الاپ۔ لیکن اسے ختم کیجئے۔ مجھے اس شور و غل سے وحشت ہونے لگتی ہے۔“

دو ایک دن کے بعد ایک نیا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ شرمیتی جی کہنے لگیں۔ ”آپ کے اس نگوڑے کتے نے ہماری بلی کا دم ناک میں کر رکھا ہے۔ ایک سنڈ چین نہیں لینے دیتا۔ اسے یا تو خود کہیں چھوڑ آئیے ورنہ میں اسے گھر سے نکال دوں گی۔“ ہم نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”شرمیتی جی ہم نے مانا کہ آپ کو اپنی بلی بہت عزیز ہے کہ آپ اسے میکے سے ساتھ لائی بھتیں۔ لیکن یہ بھی سوچئے کہ ہمارا کتا بھی ہمیں کم عزیز نہیں۔ یہ ہمارا اس زمانے کا ساتھی ہے۔ جب ہم بالکل بے یار و مددگار تھے۔“

”ہوگا آپ کا ساتھی۔“ انہوں نے چمک کر کہا۔ ”لیکن اس کا یہ مطلب

نہیں کہ وہ ہماری بلی پر ناجائز رعب جماتا پھرے۔
 ہم نے شرارتاً عرض کیا۔ آپ ہم پر رعب جماتی ہیں۔ اگر ہمارے
 گتے نے آپ کی بلی پر رعب جمالیا۔ تو کیا مضائقہ ہے؟
 انہوں نے مزاج کے پہلو کو نظر انداز فرماتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے
 اس کی حرکتیں سخت ناپسند ہیں۔ خیریت اسی میں ہے کہ اُسے کہیں چھوڑ
 آئیے۔“

ایک عجیب بات جو شرمیتی جی میں دیکھی یہ تھی۔ کہ انہیں ہر چیز
 سے نفرت تھی۔ جو بھی پسند تھی۔ اگر بھی مطالعہ مرغوب تھا۔ تو انہیں
 کشیدہ کاری۔ اگر بھی مٹاٹر پسند تھے تو انہیں کریلے۔ ہم ٹیکسیٹر پر جان
 دیتے تھے تو وہ کالی داس پر۔ حساب لگا کر دیکھا کہ جو چیز بھی پسند ہے۔
 وہ شرمیتی جی کو بالکل پسند نہیں۔ خاص طور پر شرمیتی جی کو ہمارے ”مضامین“
 سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ گھنٹوں کی مغز پچی کے بعد جب ہم ایک اچھا
 مضمون لکھتے اور داد طلب نگاہوں سے اُن سے سنے کی فرمائش کرتے۔
 تو وہ ناک بھول چڑھا کر کہتیں۔ ”مضمون بعد میں سنالیجے گا۔ پہلے
 ہماری بلی کو کسی اچھے ڈیٹر نری ڈاکٹر سے دکھالائیے۔ بیچاری کو پر سوں
 سے زوروں کی کھانسی ہو رہی ہے۔“ ان حالات میں ہم خاک مضمون سناتے
 دانت پیس کر رہ جاتے۔

خیر یہ سب تو زمانہ ماضی کی باتیں ہیں۔ اب جبکہ ہماری شادی کو
 بیس برس ہو گئے ہیں اور ہم نہ صرف ایک بیوی کے خاوند بلکہ نصف

درجن بچوں کے والد بزرگوار بھی ہیں۔ حالت اور بھی دگرگوں ہے۔ ہم نے سمجھا تھا کہ کچھ عرصے کے بعد شرمیتی جی کے مزاج میں سنجیدگی آجائیگی۔ لیکن معلوم ہوا۔ کہ یہ محض ہمارا وہم تھا۔ ان دنوں یہ کیفیت ہے کہ شاید ہی کوئی دن ہوتا ہوگا۔ جب ایک آدھ جھڑپ نہیں ہوتی۔ اور کئی بار تو ایک ہی دن میں کئی جھڑپیں ہو جاتی ہیں۔

ہم تھکے ماندے شام کے چار بجے کا لچ سے واپس آئے شرمیتی جی ایک جاسوسی ناول پڑھ رہی ہیں۔ ہم نے بڑی مدہم آواز میں کہا۔ ”بہت پڑھ لیا۔ اب آئیے۔ چائے کا انتظام کیجئے۔“ انہوں نے مسنی ان مسنی کہنے ہوئے ناول کا مطالعہ جاری رکھا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد ہم نے پھر کہا۔ ”چھوڑیئے بھی اب اسے پھر کسی وقت پڑھ لیجئے گا۔ اس بار انہوں نے خشم آلود نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”واہ! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ابھی ابھی تو کہانی کا لطف آنے لگا ہے۔ چھوڑ کیسے دوں۔“

”خاک لطف آنے لگا ہے۔ ہوتا ہی کیا ہے ان ناولوں میں۔“

”واہ! ہوتا کیوں نہیں۔ ڈاکو پانچواں قتل کر کے بھاگ گیا ہے۔“

پولیس جیپ میں بیٹھ کر تعاقب کر رہی ہے۔ سارے شہر میں کھرام مچا ہوا ہے۔ بیچارہ سراغرساں پر لیشان ہے اور آپ کہتے ہیں کچھ ہو ہی نہیں رہا۔“

چند منٹ بعد ہم نے پھر ان کی توجہ چائے کی طرف دلائی۔ وہ

برستور ناول پڑھتی رہیں۔ آخر تنگ آکر ہم نے کہا۔ ”غود غرضی کی حد ہو گئی۔ یہاں چائے بغیر دم نکلا جا رہا ہے۔ لیکن ہے کسی کو خیال۔“

”جی ہاں۔ اور آپ کم خود غرض ہیں نا!“ انہوں نے طنز کا بھرپور وار کرتے ہوئے فرمایا۔ ”یاد ہے پرسوں کہا تھا۔ سینما لے چلیے اور ٹکا سا جواب دیا تھا۔ مجھے مس نلنی کی پارٹی میں جانا ہے۔“

”لیکن ہم مس نلنی کی پارٹی سے کیسے غیر حاضر ہو سکتے تھے؟“

”ٹھیک ہے۔ تو پھر جانیے نا مس نلنی کے ہاں۔ آج بھی مہسی سے چائے پی لیجئے۔“

چائے کی بجائے ہم لہو کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

کسی رات ذرا دیر سے گھر لوٹے۔ انہوں نے بچوں کی موجودگی میں ہی ہمارا ”کورٹ مارشل“ شروع کر دیا۔

”شکر ہے آپ کو گھر کی بھی یاد آتی۔ ذرا دیر سے آنا تھا۔ ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں۔“

ہم نے اپنی صفائی میں ایک آدھ معقول عذر پیش کیا۔ انہوں نے اس کی بالکل پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جی ہاں۔ گھر جائے جہنم میں۔ آپ کو آٹے دن جلسوں اور کانفرنسوں سے کام۔ کوئی نہ بھی مدعو کرے جائیں گے ضرور۔ وقت جو برباد کرنا ہوا۔“

”دیکھئے آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ مجھے اس جلسے کی صدارت کرنا تھا۔“

”جی ہاں۔ آپ کے علاوہ بھلا انہیں اور کوئی صدر کہاں ملے گا۔
آپ قابل ترین آدمی جو ٹھہرے“

”قابل ہوں یا نااہل۔ جب کوئی مدعو کرے۔ جانا ہی پڑتا ہے“

”تو کون کہتا ہے۔ نہ جانیئے۔ آپ کو ڈر کس کا ہے؟“

”ڈر نہ ہوتا۔ تو واپس کیوں آتے؟“

بڑا احسان کیا ہے۔ پھر چلے جانیئے کسی اور جلسے کی کرسی صدر
انتظار کر رہی ہوگی۔“

”آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہوتی ہیں۔“

”جی ہاں۔ یہ میری پرانی عادت ہے۔“

”یہ میں نے کب کہا۔ میرا مطلب ہے آپ کی طبیعت“

”جی ہاں۔ میری طبیعت بہت بُری ہے۔ قسمت اس سے بھی

بُری ہے۔“

”آپ بھر قسمت کا رونا لے بیٹھیں۔ آخر ہو کیا گیا۔“

”کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں تو یونہی پاگل ہوں۔“

”میں نے آپ کو پاگل تو نہیں کہا۔“

”نہیں کہا۔ تو اب کہہ لیجئے۔ یہ حسرت بھی کیوں رہ جائے۔“

نتیجہ اس بحث کا یہ ہوا کہ انہوں نے بڑی بے دلی سے کھانا

پیش کیا۔ ہم نے دو چار لقمے زہر مار کئے۔ اور چپ چاپ سونے کے کمر
میں چلے گئے۔

کرتا ہوا آپ کے دل و دماغ میں گونج رہا ہوگا۔ جیسے کہ رہا ہو۔
 ”میری جان! تم اس حادثے کو مذاق سمجھ رہے تھے؟ یہ تو ایک اٹل
 حقیقت ہے۔ اس کی ضرب نہایت کاری ہے۔ ذرا احتیاط کرنا اور نہایت
 پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ زندگی اتنی سادہ لطیف اور نظر انداز کئے
 جانے کے قابل چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ایک بھرپور چوٹ ہے۔ اس
 چوٹ کو سہنے کی قوت پیدا کرو۔ ورنہ مر جاؤ گے۔ پس جاؤ گے!“
 پکوری باتوں کا بے ساختہ انداز اور ہلکا پھلکا پن اتنی خوفناک
 سنجیدگی کے اثرات رگ و پے میں چھوڑ جاتا ہے کہ بسا اوقات تو میں اس
 سے دوبارہ ملتے ہوئے ڈرنے لگتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ وہ پھر اسی
 بے ساختہ پن سے باتیں کرے گا۔ قہقہے لگائے گا۔ ہاتھ پر ہاتھ مارے گا۔
 اور اپنے انداز کی شدت چھپی ہوئی گہری قنوطیت۔ پتھر یے دکھ اور
 اٹل نمکینی کی پرچھائیں بھی مجھے نہیں دکھائے گا۔ کتنا خوفناک ہے۔
 یہ طنز نگار کتنا بڑا مذاق کرتا ہے یہ دنیا بھر سے، کتنی پیچیدگی کے
 مراحل طے کرنے پر تے ہیں۔ اس کے اصلی مرکز تک پہنچنے کے لئے۔
 وہ آپ کو پتہ نہیں چلنے دے گا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ کیوں
 کہہ رہا ہے؟ ————— جو کچھ اُسے کہنا چاہئے۔ کیا اُسی چیز کے متعلق
 ہی کہہ رہا ہے؟ آپ کے مسئلے کو وہ کسی بندھے بندھاٹے فارموے
 کے ذریعے حل نہیں کرتا۔ کسی بنے بنائے زاویے سے اُسے نہیں دیکھتا
 اگر آپ اس سے پوچھیں ————— کہ پانچ میں سے آٹھ تقریبی کر دے

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیر و تفریح سے گھر لوٹے اور عجیب
 نظارے دیکھنے کو ملے۔ بڑے لڑکے نے چھوٹے کو بڑی بے رحمی سے پیٹا
 ہے۔ وہ ڈھاریں مار مار کر رو رہا ہے۔ چھوٹی منی کو بخار ہے۔ وہ درد
 سے کراہ رہی ہے۔ سب سے چھوٹا منادودھ کے لئے چلا رہا ہے شیرمٹی
 جی غیض و غضب کی حالت میں اپنا غصہ کبھی ایک اور کبھی دوسرے
 بچے پر اتار رہی ہیں۔ اور ساتھ ساتھ ایسی بد دعائیں دے رہی ہیں۔
 کہ اگر وہ قبول ہو جائیں۔ تو گھر میں ان کے علاوہ کوئی زندہ نہ رہے۔
 یہ نظارے دیکھ کر جی میں آتا ہے کہ گھر بار چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ اور
 ایک دفعہ پھر کوچہ بلی ماراں کے نکرٹوالے مکان میں جا بسیں۔ جہاں
 اپنے سوا کوئی نہ ہو۔ بس ایک معمولی سا صوفہ ہو۔ دو تین کرسیاں۔ چند
 دلچسپ کتابیں۔ ایک کتا۔ اور ایک وائیکن۔ پڑھتے پڑھتے اکتا جائیں
 تو کتے سے کھیلنے لگیں۔ اور کتے کی شرارتوں سے تنگ آ جائیں تو وائیکن
 بجانا شروع کر دیں +

خط کا جواب

ہر ایک بڑے آدمی میں ایک نہ ایک وصف ضرور ہوتا ہے۔ مہاتما گاندھی بکری کا دودھ۔ اقبال حقہ اور ڈاکٹر جانسن قہوہ پیتے تھے۔ مجھ میں یہ وصف ہے کہ میں کسی بھی شریف آدمی کے خط کا جواب نہیں دیتا یعنی خط کا جواب پنی جاتا ہوں۔ آپ کہیں گے وصف کی بھی ایک کہی۔ یہ تو اچھی خاصی بددماغی ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں اور غالباً آپ کو اس سے انکار نہ ہوگا کہ بڑے آدمیوں کی بددماغیوں کا شکار اکثر اوصاف میں کیا جاتا ہے اور پھر یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ کوئی بڑا آدمی کسی چھوٹے آدمی کے خط کا جواب نہیں دیتا۔ آپ کو یقین نہ آئے تو کسی بڑے آدمی کو خط لکھ کر دیکھ لیجئے۔ آپ حشر تک انتظار کیجئے۔ جواب نہیں آئیگا۔ مجھے یاد ہے (یہ اس وقت کی بات ہے جب میں خود بڑا آدمی نہیں تھا) میں

نے ٹھکر کو ایک خط لکھا۔ مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

برادرِ مٹھکر !

انقلاب سے خفا نہ ہو جائے۔ برادرِ مٹھکر اس لئے لکھا کہ خاکسار بھی آپ کی طرح آرین ہے۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے۔ ہر رات لندن پر کیوں مباری کی جا رہی ہے۔ انگریز لاکھ دشمن سہی لیکن اتنے بُرے نہیں کہ ان کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ آخر وہ بھی آرین ہیں۔ یہودی ہوتے تو شاید چنداں مضائقہ نہیں تھا۔ آخر میں صرف اتنا کہنا ہے کہ لندن پر مزید مباری کرنے سے باز آئیے۔ اور اس خط کا جواب دیجئے کہ دل کو تسلی ہو۔

اس خط کا کوئی جواب نہ آیا۔

مشہور ہالی ووڈ ایکٹریس "گری ارگارسن" کو میں نے ایک دفعہ

مندرجہ ذیل خط لکھا:-

ڈیر گری ارگارسن !

جب سے آپ کو ایک فلم میں ہیرو سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے دل چاہتا ہے کہ آپ سے ملاقات کی جائے۔ لیکن افسوس ہالی ووڈ بہت دور ہے اور خاکسار کے پاس ہوائی جہاز ہے نہ موٹر سائیکل۔ صرف ایک ہی صورت ہے۔ اگر آپ ہوائی جہاز کا گریہ اپنی پہلی فرصت میں سمجھادیں۔ تو آپ سے ملاقات کے علاوہ امریکہ کی سیر مفت میں ہو جائے۔ خط کا جواب ضرور دیجئے گا۔

اس خط کا بھی کوئی جواب نہ آیا۔

آپ کیس گئے۔ یہ دونوں خطوط اس قابل ہی کپ تھے کہ ان کا جواب دیا جاتا۔ میں کہوں گا۔ بہت سے خطوط جو مجھے آتے ہیں وہ بھی اس قابل کب ہوتے ہیں کہ ان کا جواب دیا جائے۔ لیجئے آج کی ڈاک سے میں آپ کو تین خطوط پڑھ کر سناتا ہوں۔

(۱)

مکرمی !

آپ کو یاد ہو گا کہ آج سے تین سال قبل آپ نے شاید بجلی کا بل ادا کرنے کے لئے مجھ سے پانچ روپے قرض لئے تھے کہ جو آپ نے آج تک ادا نہیں کئے۔ کیا میں امید کروں کہ آپ یہ رقم ادا کر کے ایک پرلے قرض سے سبکدوش ہونے کا خوش گوار فرض ادا کریں گے ؟

(۲)

محترمی !

میں ایک گمنام ادیب ہوں۔ اس وقت تک ڈیڑھ سو کہانیاں لکھ چکا ہوں۔ ان میں سے شائع ایک بھی نہیں ہوئی۔ میں اپنی کہانیوں کا مجموعہ چھپوانا چاہتا ہوں لیکن کوئی ناشر اسے چھاپنے کے لئے تیار نہیں اگر آپ دیا چھ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو شاید کوئی ناشر اپنے سینے پر بٹن رکھ کر انہیں چھاپ ہی لے۔ میں اس اتوار کو آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا ہوں۔ کھانا آپ کے ہاں ہی کھاؤں گا۔ امید ہے آپ دو ایک

گھنٹوں میں دیباچہ لکھ لیں گے اور میں چار بجے کی گاڑی سے گھر لوٹ سکونگا۔

(۳)

برادر! السلام

کل پتہ چلا کہ آپ ان دنوں موگا میں مقیم ہیں۔ آپ شاید میرے نام سے تو واقف نہ ہوں کام سے ضرور واقف ہونگے۔ میں پچھلے تین مہینوں سے ایک رسالہ نکال رہا ہوں۔ عام نمبر کوئی خاص کامیاب نہیں ہوئے۔ اس لئے ایک خاص نمبر نکالنے کا خیال ہے کیا میں اُمید کروں کہ آپ اس کے لئے کوئی تازہ مضمون بھیج کر مجھے ممنون فرمائیں گے۔ مضمون کے علاوہ اگر رسالہ کے دس پندرہ منتقل خریدار بنا سکیں تو شاید یہ رسالہ چل ہی سکے۔

آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ ان خطوط کا کیا جواب دیا جائے۔ تبھی تو میں کہتا ہوں کہ بہت سے خطوط کا بہترین جواب ”خاموشی“ ہی ہے۔ کسی نے آپ کو خط لکھا اور اگر وہ مرزا غالب۔ جان کیٹس یا لارڈ بائرن نہیں ہے تو یقیناً اس نے نہایت اوٹ پٹانگ باتیں لکھی ہونگی۔ اس نے خط لکھنے کی حماقت کی۔ آپ اس کے خط کا جواب دے کر خواہ مخواہ پتہ تو قیوں نہیں اس لئے خط پڑھئے اور اس دعا کے ساتھ کہ خدا لکھنے والے کو بہتر خط لکھنے کی توفیق دے۔ ردی کی ٹوکری میں ڈال دیجئے۔ اگر شو مٹی قسمت سے اس شخص سے کبھی ملاقات ہو جائے اور نوبت شکوہ شکایت تک پہنچے تو نہایت سنجیدگی سے کہہ دیجئے۔ ”برادر! اول تو آپ نے مجھے خط لکھا ہی نہیں۔ اگر لکھا گیا تو پوسٹ نہیں کیا ہوگا۔ اگر پوسٹ کیا تو مجھے ملا نہیں۔ اگر مجھے

ملا۔ تو میں نے اس کا جواب ضرور دیا ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ کو نہ ملا ہو۔ اگر وہ یہ عذر قبول کر لے تو بہتر وہ نہ یوں کہیے۔ ”ہو سکتا ہے آپ نے مجھے خط لکھا ہو۔ لیکن مجھے نہیں ملا۔ اس میں نہ آپ کا قصور ہے نہ میرا۔ دراصل پچھلے تین مہینوں میں پانچ دفعہ مکان تبدیل کر چکا ہوں۔ پہلا مکان اس لئے چھوڑنا پڑا کہ اس میں چوہے بہت تھے۔ پلیگ پھوٹنے کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا۔ دوسرا اس لئے کہ ہمسایے شریف نہ تھے۔ ہر وقت پوچھتے رہتے تھے آپ وہلوی ہیں یا لکھنوی۔ تیسرا چوتھا اور پانچواں اس لئے کہ کرایہ ادا نہ کر سکا۔ الغرض عجیب پریشانیوں میں مبتلا رہا۔ آپ نے خط ضرور لکھا ہوگا لیکن ڈاکیہ اسے کوئی گھر میں ڈال گیا۔ اس کا علم ڈاکیہ کے سوا کسی کو نہیں۔“

اگر وہ پھر بھی نہ مانے۔ تو آپ ایک مصنوعی قمقمے کے ساتھ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہیے۔ ”ارے بھئی! کیسی باتیں کرتے ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تمہارا خط آئے اور میں جواب نہ دوں۔ واللہ میرا تو جی چاہتا ہے کہ تمہارے خط کے جواب میں تین خط لکھوں۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھوں۔ جب تک کہ تم گھر کر مجھے خط لکھنا بند نہ کرو۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ تم خط لکھتے ہی نہیں۔“

ظاہر ہے کہ یہ حربے اکثر ناکام ثابت ہونگے۔ لیکن ان کی ناکامی کا فائدہ آپ کو ہوگا۔ آپ کا دوست سمجھ جائیگا کہ آپ خط کا جواب دینا نہیں چاہتے۔ اور آئندہ سوچ سمجھ کر خط لکھنے گا۔

کیا محبوب کے خط کا جواب دینا چاہیے یا نہیں؟ میری دانت میں بالکل
 نہیں۔ اول تو آپ کو آپ کے گھر والے ہمیشہ اس طرح گھیرے رہتے ہیں
 کہ محبوب کا خط تنہائی میں پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اور اگر بالفرض
 سب کی آنکھ سچا کر آپ نے پڑھ لیا۔ تو پھر جواب دینے کے لئے جو
 یکسوئی اور فراغت درکار ہے۔ وہ ایک اوسط گھرانے میں کیسے میسر
 ہو سکتی ہے۔ اور پھر سچ بوجھے۔ تو جب سے ڈاک اور تار کے سلسلے
 معرض وجود میں آئے ہیں محبوب کو خط لکھنے کا سارا مزہ ہی کر کر اہو گیا۔
 کیا بھلے دن تھے جب عشاق خط بھیجنے کے لئے کبوتر پالا کرتے تھے۔
 سب سے پہلے کسی باغ سے بہنکایا پھینکا کر ایک اکیلے سا کبوتر پکڑ
 لاتے۔ پھر اسے محبوب کے گھر کا راستہ سمجھاتے۔ بعد ازاں شعرا کے دواویں
 کا مطالعہ کرتے تاکہ اچھے اچھے اشعار لگ جائیں اور اس کے بعد
 کسی فرصت کے وقت خط لکھ کر اس پر نفیس سا عطر چھڑکتے اور کبوتر
 کے پر کے ساتھ احتیاط سے باندھ کر کہتے۔ ”جان عاشق۔ لپک کے
 جاؤ۔ اور کرارہ سا جواب لے کر آؤ۔“ کبوتر خط لے کر اپنی کھوٹی ہوئی
 کبوتری کی تلاش میں نکل جاتا۔ اور عاشق میاں انتظار کرتے کرتے پاگل
 ہو جاتے۔ اس انتظار میں جو مزا تھا۔ وہ کسی پرانے زمانے کے عاشق
 سے پوچھتے۔ اب نہ عشاق رہے نہ کبوتر۔ تختہ ہی پلٹ گیا۔

آج کل کیا ہے۔ دو آنے کا لغافہ لیا۔ غلط سلاط اور دو یا انگریزی میں
 چند فرسودہ فقرے لکھے۔ اور چپکے سے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ اگر محبوب

کے والدین کے ہاتھ لگ گیا۔ تو کالج سے نکالے گئے۔ اور نہ لگا تو کھٹاک
 سے جواب آگیا۔ لیجئے اب جواب کا جواب کہتے رہیے۔
 آپ کسی پہلو سے اس مسئلہ کو دیکھیں۔ آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا۔
 کہ خط کا جواب نہ دینے میں جو راحت اور مسرت ہے وہ خط کا جواب دینے
 میں نہیں۔ خط کا جواب تو جاہل سے جاہل انسان دے سکتا ہے لیکن
 خط کا جواب نہ دینے کے لمحہ بڑی سمجھ۔ ہمت اور دوامدستی کی ضرورت
 ہے۔ مالی نقطہ نگاہ سے ہی دیکھئے۔ اگر آپ متواتر تین چار سال احباب
 کے خطوط کا جواب نہ دیں۔ تو نہ صرف آپ ڈاک خانے میں جا کر قطار
 میں کھڑا ہونے کی زحمت سے بچے رہیں گے۔ بلکہ آپ کے پاس اتنی رقم
 جمع ہو جائے گی جس سے آپ اپنے ورزی کا بل ادا کر سکیں گے۔ پس
 ورزی کا بل ادا کیجئے اور ورزی کی دعائیں لیجئے۔ اور خدا کا شکر بجالائیے
 کہ اس نے آپ کو اتنی توفیق دی کہ آپ زندگی میں کم از کم ایک بل تو
 ادا کر سکے !

10810

سوم پرکاش ساہنی پرنٹر و پبلشر نے باہتمام اشوکا پریس دریا گنج
 میں چھپوا کر برائے لاجپت لائے اینڈ سنٹر شائع کیا !

افسافوی ادب

پردہ مجاز

۶/- پریم چند — (ناول)

نہیں

۵/- پریم چند — (ناول)

کر بنا

۲/۸ پریم چند — (ڈرامہ)

خواب خیال

۲/۸ پریم چند — (افسانے)

ردھی رانی

۱/۴ پریم چند — (ڈرامہ)

سولہ سنگار

۴/- سُدرشن — (افسانے)

زندگی کے سائے

۲/- بلال احمد — (افسانے)

جوار بھاتا

۳/- رامانند ساگر — (افسانے)

آئینے

۳/۰ رامانند ساگر — (افسانے)

شاہراہ زندگی

۱/۲ مترجمہ رام سرورپ کوشل (نہیات)

پریت کے گیت

۲/۴ الطاف مشہدی (گیت)

مذابہب اور انسانیت

۳/۸ ہر دیال ایم اے —

عورت مرد کے تعلقات

۷/- تالستانی — (جنیات)

لاجپت رائے اینڈ سنز پبلشرز دہلی

بال و پر

جائیں۔ تو کیا باقی رہے گا۔ تو وہ ایک مخصوص فقہہ کے ساتھ آپ کے
 ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہے گا۔ ————— چھوڑ دیار! اگر کچھ بچ بھی گیا۔ تو
 کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ ویسے میرے خیال میں آٹھ کا ہندسہ
 کوئی معقول ہندسہ نہیں ہے۔ اگر اس کا نام آٹھ نہ ہوتا۔ بلکہ کچھ اور
 ہوتا۔ مثلاً دو یا تین۔ تو زیادہ خوبصورت شکل اختیار کر سکتا تھا۔
 اور پھر وہی بے ساختہ فقہہ۔ جیسے کسی بہت بڑے مالاب میں
 زہر کی چٹکی نہایت تیزی کے ساتھ گھول رہا ہو۔ وہ دیکھ رہا ہوتا
 ہے۔ کہ کسی بات کا واضح شعور دُکھ کی علامت ہے۔ اور وہ دُنیا کو
 دُکھ دینے نہیں بلکہ دُکھوں پر مسکراہٹ کا رنگ چھڑکنے کے لئے
 آیا ہے۔ اگر کوئی دُکھ، مسکراہٹ کے خوش رنگ پرفے میں لپٹا لپٹا یا
 ہوا زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا رہے۔ تو اس کم سخت کی ٹیسیں تو کم
 ہو جاتی ہیں۔ ————— اس لئے کپور کی باتیں سمجھ میں کم آتی ہیں۔
 جذبات سے زیادہ نزدیک ہوتی ہیں۔ کپور جو کچھ کہتا ہے۔ اس سے
 اتنا بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ بخیدگی کے ساتھ بات کر رہا ہے یا مذاق
 میں اُڑا رہا ہے۔ اس لحاظ سے تجاہل عارفانہ کی ترکیب اس کی شخصیت
 کے لئے نہایت موزوں بن جاتی ہے۔

اور اس کے کردار کی یہی خوبی (اگر اُسے غیبی کہا جاسکے) اس کے
 طنزیہ آرٹ میں بُری طرح گھس کر آگئی ہے۔ وہی ساوہ ساوہ سے
 فقرے وہی ہلکے پھلکے سے الفاظ، عام فہم سا سگفتہ بیان۔ لیکن آپ کی

فطر اس کے مضمون پر پھیلتی چلی جائے گی۔ آپ کے دماغ میں سنسنی کھیلتی ہوئی ٹیسیں مٹھتی چلی جائیں گی۔ اور ایک سادہ سے تسلسل میں گنڈھا ہوا اس کا مضمون آپ کے دل و دماغ کو بے چین کرتا چلا جائے گا۔ یہ بے چینی مٹھاس بھری ضرور ہوگی۔ لیکن اس مٹھاس سے آپ کو چڑچڑاہٹ بھی ہونے لگے گی۔ کہ اس شخص کو پڑھنے والے پر اتنا بھی رحم نہیں آتا۔ کہ اگر ضرب لگانی ہے تو ایک ہی مرتبہ سیدھے سبھاؤ لگاؤ۔ یہ بھی کیا کہ چوٹ بھی لگائی اور پھر دماغ میں اس قسم کی کیفیت بھی پیدا کر دی۔ کہ ”براوریم!“ اس چوٹ کو ہلکے ہلکے سہلاؤ۔ بڑا مزا آئے گا۔ سہلانے کا مزا مسلم! مگر اس سے چوٹ کا مادی نتیجہ تو بدل کر نہیں رہ جائے گا۔

اور میں کہتا ہوں۔ کہ کپورہ نتیجے کی حقیقت تک تو آپ کو پہنچا ہی دیتا ہے۔ اور اس راستے سے پہنچا دیتا ہے جیسے آپ کسی ریشمی بنگورے میں جھولتے ہوئے دماں تک پہنچ گئے ہوں اور نتیجے تک نہایت خوبصورت اور خوشگوار انداز میں پہنچا کر آپ کو چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس لئے چھوڑ دیتا ہے کہ اس کی ذمہ داری یہاں تک آکر ختم ہو ہو جاتی ہے اس کا کام تو یہی ہے کہ نہایت پُر اسرار اور خوبصورت چالاک کی کے ساتھ آپ کو نہ ہر ملی حقیقت کے پاس لے جائے۔ اگر وہ آپ کو کانٹے بھرے راستے سے لے جاتا۔ تو ممکن ہے آپ راستے ہی میں دم توڑ کر رہ جاتے لیکن وہ انسانیت کا ظالم جراح نہیں

ہے ہمدرد ڈاکٹر ہے — اس ہمدرد ڈاکٹر کے پاس اپنا ایک خاص قسم کا کلوروفارم ہے جس کے ذریعے وہ انجکشن کرتا ہے۔ یہی کلوروفارم اس کا آرٹ ہے۔ اس مخصوص کلوروفارم ہی سے یکور کے مریض صحت و شفا کا کیل کھیلے ہیں۔

چونکہ وہ کوئی دیوتا اور فرشتہ نہیں ہے۔ اس لئے عام انسانی خصائص اپنی کمزوریوں اور خوبیوں کے ساتھ اس میں بھی موجود ہیں بعض لوگ اس کی ان کمزوریوں کا ذکر کردہ کے لذت حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ چائے کی میز پر بیٹھے ہوئے اگر آپ اس کے سامنے سگریٹ کی بھری ہوئی ڈبیہ پھینک دیں۔ تو وہ اپنے بہت سے اہم پروگرام بدل کر اس سگریٹ کی ڈبیہ کو ختم کرنے کی خواہش میں گرفتار ہو جائے گا۔ اور آخری سگریٹ نکال کر اسے سلگاتے ہوئے ایک انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوگا۔ جیسے وہ انگڑائی کہہ رہی ہو۔ ”اب کیا رہ گیا ہے اس ڈبیہ میں۔ اب بیٹھے رہنے کے کیا معنی ہیں؟“ — ہوٹل میں چائے کا بل آگے کوئی دوسرا ادا کرے تو اس کی طرف یوں دیکھے گا، جیسے کہ کہہ رہا ہو ”ٹھیک کیا تم نے دوست! تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا“ شراب کا کوئی پیگ اگر کبھی کسی نے پلا دیا۔ تو پی لے گا۔ ورنہ عمر بھر اس کے بغیر جی سکتا ہے — لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مالی اعتبار سے کنجوس ہے۔ نہیں۔ اس کے گھر پر جائے آپ کو سگریٹ پر سگریٹ

پیش کرتا چلا جائے گا۔ چائے پر چائے پلائے گا۔ بسکٹوں اور مٹھائیوں سے آپ کی تواضع کریگا۔ اور آپ کو فرط حیرت میں چھوڑ جائے گا۔ کہ یہ شخص ہوکل چائے کی میز پر اپنی بظاہر کجخو سی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ آج اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیونکر بغیر سمجھے بوجھے دھن ٹٹانا چلا جا رہا ہے۔

مگر ایسا ہے اور یہ اس لئے ہے کہ وہ ایک عام قسم کا سماجی انسان بھی ہے۔ اس کی کرداری انفرادیت۔ عام سماجی ماحول میں آکر اس سے بالکل علیحدہ ہو جاتی ہے۔ اُسے بیوی سے محبت بھی کرنی پڑتی ہے۔ گھر کی ضروریات کی چیزیں بھی مہیا کرنی پڑتی ہیں۔ ایک پروفسر کے سے معیار کو قائم رکھنے کے لئے گھر کی فضا کو بھی اسی معیار میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ بچے بھی پیدا کرنے پڑتے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال، پڑھائی لکھائی کا دھیان بھی کرنا پڑتا ہے۔ اپنی چھوٹی سی بچی کے ساتھ تو ملی زبان میں بھی باتیں کرنا پڑتی ہیں۔ اُسے ہنسنا اور گدگدانا بھی پڑتا ہے۔ جب اس کے دونوں بچے تیرکمان سنبھالنے لگے کی بندوبست بنائے اس کے سامنے اپنی بہادری کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ تو انہیں داد کے سے اندازہ میں ڈانٹنا پڑتا ہے اگرچہ یہ ڈانٹ اکثر بے اثر ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ کپور میں روایتی باپ کا سادہ بد یہ مقصود ہے۔ اس کی ڈانٹ میں مسکراہٹ کا سایہ شامل ہو جاتا ہے۔ اس لئے اپنا اثر کمبو بیٹھتی ہے اس کی ڈانٹ۔

اسے مالی لحاظ سے کبھی پریشانی نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ اپنی آمدنی کے مقابلے پر کم خرچ کرنا جانتا ہے۔ پھونک پھونک کر خرچ کرتا ہے۔ بیوی پر بچوں پر۔ گھی پر۔ راشن پر۔ کٹریوں پر اور اسی طرح کی سینکڑوں دوسری ضروریات پر۔ لیکن اس کی پیشانی پر بل نہیں آتے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے۔ کہ ڈیڑھ سو صفحے پر دف پڑھانے والا پلشتر اس کا غلام ہے۔ وہ اس کی تمام مشکلیں حل کر سکتا ہے۔ ادبی تخلیقات نے اسے کبھی مالی امداد بہم نہیں پہنچائی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی پہلی کتاب ایک پلشتر کو مفت دے دی تھی۔ اور دوست احباب کے احتجاج کرنے کے باوجود اس کی یہ ہمت نہیں پڑی تھی۔ کہ اس پلشتر سے پیسوں کا تقاضا کر سکے۔ مگر پھر بھی مالی اعتبار سے وہ مطمئن ہے۔ اس لئے کہ اس کی زندگی کے نظام میں ایک توازن اور باقاعدگی اور احتیاط شامل ہو چکی ہے۔ غریب والدین کا بیٹا مالی اعتبار سے لاابالی پن اختیار ہی نہ کر سکا۔ اگرچہ ایسے مواقع کئی آئے تھے جبکہ وہ اپنے دیرینہ خاندانی افلاس سے انتقام لے کر زندگی کو بے اختیار اور ہر سرشت لہروں پر بہنے کے لئے چھوڑ سکتا تھا۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ اور ایک مخصوص سماجی انضباط کے نیچے سے رہائی نہ پاسکا۔ اسی لئے تو اسے محلے والے ایک شریف آدمی کہتے ہیں۔ ایک معزز پڑوسی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ سماجی اعتبار سے وہ بیشتر باتوں میں ہمارا ساتھی ہے۔ اور کوئی علیحدہ ڈرا دینے والی یا حیرتناک

شخصیت نہیں ہے۔

لیکن کیا کپور واقعی ایک شریف آدمی ہے؟ ایک معزز پڑوسی ہے کیا جب وہ گفتگو کر رہا ہوتا ہے تو یوں محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے ملاقاتی کو بتا رہا ہے۔ اور اس بنانے میں اسے انتہائی اہلیانہ قسم کی لذت محسوس ہو رہی ہے۔ اس قسم کی اہلیانہ لذت کا مظاہرہ اس نے ایک بار ایک محفل میں کیا تھا۔ بد قسمتی سے ایک آدمی کپور سے بحث میں الجھ پڑا۔ کپور نے دوران گفتگو میں اس سے کہا۔ میں آپ کو شریف آدمی سمجھتا تھا۔ بغیر سوچے سمجھے اور چوٹ کا جواب چوٹ میں دینے کی غرض سے اس شخص نے بھی کپور سے کہہ دیا کہ میں بھی آپ کو شریف آدمی ہی سمجھتا تھا۔ یہ چوٹ کوئی اتنی وزنی نہیں تھی۔ اس لئے کپور نے چوٹ کو وزنی کرنے کی خاطر اس شخص سے کہا۔ آپ ٹھیک سمجھے تھے دراصل غلطی مجھ سے ہوئی۔“

اور ایک لمحے تک تو وہ آدمی کچھ چکرا سا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب ساری محفل کو چوٹ کی گہرائی کا احساس ہوا۔ تو سارے کھلکھلا کر منہں پڑے۔

کپور اس قسم کا بہادر آدمی بھی نہیں ہے کہ اپنے مخالفت کو بیباکانہ چیلنج کر سکے۔ اپنے بل بوتے پر اعتماد کر کے اسے محاربے کے لئے پیکار سکے اگرچہ ایک طنز نگار کی زندگی ایسے حادثوں کے امکانات سے بھرپور ہو جاتی ہے جن کی وجہ سے مخالفین کی ایک عجیب و غریب جماعت

پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کچھ کے خیال سے یہ بھی ایسا ہوا ہے۔ وہ اگر کوئی چوٹ
 کرتا ہے۔ کیونکہ وہ چوٹ کرنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔ تو بعض چوٹ
 پہنے والے بلبلا اٹھتے ہیں۔ اور جب یہ بھی دیکھتے ہیں کہ چوٹ لگانے
 والا کپور جیسا مخنی اور ڈبلا پتلا شخص ہے تو آنکھیں بھی نکالنے لگتے
 ہیں۔ اگر جواب میں کپور بھی آنکھیں نکال سکتا۔ تو شاید کپور آج اپنی
 شکست خوردہ حالت میں دکھائی نہ دیتا۔ اس کی شخصیت کے تمام خطوط
 اس امر کی غمازی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کہ مجھ سے
 تمہیں کیا لینا ہے بھائی؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ میں تمہارا کچھ
 بگاڑ بھی کیا سکتا ہوں؟ میں تو ایک شریف سا انسان ہوں۔ باقی رہی
 طنز۔ وہ تو میرے بس کار و گ نہیں۔ اس پر میرا کچھ اختیار بھی نہیں۔
 وہ تو میری فطرت میں بغیر اتہ پتہ لگائے داخل ہو گئی۔ کہ اس افلاس زدہ
 ہڈیوں کے ڈھانچے اور کمزور سے انسان کے اندر داخل ہونا اس
 کے ساتھ مذاق کرنا تو نہیں۔

چنانچہ سپردگی اور بے چارگی کا یہ انداز اسے کہیں بھی مقابلہ باز کی
 حیثیت میں پیش نہیں ہونے دیتا۔ ایک مرتبہ لاہور کی ایک ادبی انجمن
 حلقہٴ آرابابِ فوق میں اس کے ایک طنزیہ مضمون پڑھنے پر لاہور کا ایک
 سیاسی وکیل اور ادبی مجاہد کو کھلا اٹھاتا تھا۔ اور کپور کے خلاف وہ طوفان
 بدتمیزی اٹھایا تھا کہ کپور کو اعترافِ شکست بھی کرنا پڑتا تھا۔ اور معافی
 بھی مانگنی پڑ گئی تھی۔

اسی طرح ایک دوسری مرتبہ اس کے مشہور مضمون ”اہل زبان“ پر لاہور سے پٹنہ تک ایک ہیجان برپا ہو گیا تھا۔ اور چاروں طرف سے ”نراہ مان! نراہ مان! کی صدائیں گونجنے لگی تھیں۔ وہ تو کہتے۔ چند ایک پشت پناہوں نے کپور کو اہل زبان سے ان تابڑ توڑ حملوں سے بچا لیا۔ ورنہ شاید کپور یہاں بھی معذرت طلب کر کے یہ وعدہ کر لیتا کہ میں ہندوستان چھوڑ کر چین چلا جاؤنگا۔ اور اسی طرح اپنی طنز یہ عظمت کا ایک اور ثبوت مہیا کر دیتا۔ کہ دوستو! مجھ میں لڑنے مرنے کی تاب نہیں ہے۔ ویسے انصاف سے دیکھا جائے۔ تو تم میں بھی کوئی خاص ایسی تاب و اب نہیں ہے۔ جس کے بولنے پر تم میری طنز کو برداشت کر سکو۔ طنز برداشت کرنے کے لئے میرے جیسا کیجیو چاہیے۔ ویسے تمہاری تلملاہٹ سے مجھے اتنی تسکین تو ہی جاتی ہے کہ میری باتوں میں واقعی چھین ہے۔ اور چھین جھوٹ پر نہیں ہمیشہ سچ کی نوک پر نمودار ہوتی ہے۔

بہت سے قسم کے لوگوں میں کپور کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن یہ عزت بھی ہر جنس کے لئے مختلف قسم کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ پروفیسر لوگ کپور کی عزت اس لئے نہیں کرتے۔ کہ اس کا ایک ادبی مقام ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ پڑھانے کے ایک خاص ڈھب کا مالک ہے۔ کالج کے طالب علم اس کی عزت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ایک پاپولر پروفیسر ہے بلکہ اس لئے کہ اس کے لکھے ہوئے خلاصے بڑے کام کی چیز

ہوتے ہیں اور امتحانوں کے پاس کرنے میں مدد پہنچاتے ہیں۔ ادیب لوگ اس کی عزت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ایک اچھا ادیب ہے بلکہ اس لئے کہ اس کی گفتگو نہایت دلچسپ ہوتی ہے۔ پبلشرز اس کی عزت اس لئے نہیں کرتے۔ کہ وہ اچھی گفتگو کر سکتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی کتاب بکٹی خوب ہے۔ محلے والے اس کی عزت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ایک اچھا پیر و فیئر ہے بلکہ اس لئے کہ وہ ایک شریف پڑوسی ہے اس کے اپنے بچے اس کی عزت اس لئے نہیں کرتے۔ کہ وہ ایک جابر باپ ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی عزت کرنے میں کوئی خاص بنیادی فرق نہیں پڑ جاتا۔ اور اب رہی اس کی بیوی، تو وہ کپور کی عزت ایک ایسے خاوند کے نقطہ نظر سے کرتی ہے۔ جس کا اس دنیا میں سوائے بیوی کے کوئی نہ ہو۔

ایک اور قسم کی عزت سب سے نرالی ہے اور کپور کے شایان شان بھی۔ اور وہ ہے لاہور کی ایک دیرینہ ادبی انجمن کی طرف سے کپور کی عزت افزائی۔ اور وہ یوں کہ اس حلقہ کے بعض سربرآوردہ ارکان اس کی عزت اس لئے کرتے ہیں کہ عزت کئے بغیر ان کے سامنے اور کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا۔ ورنہ بقول کپور کے، اگر ان کا بس چلے۔ تو کپور کو کچا چبا جائیے۔ اور اس کے مضمون میں زبان کی غلطیاں نکال نکال کر کپور کو آدھ مٹوا کر دیں۔

حسن اور عشق کے روایتی معاملہ میں کپور کے کاغذات بالکل کوسے

چلے گئے ہیں۔ ان کا غدو کو چھوؤ اتک نہیں گیا۔ اور آج تک یہ عالم ہے کہ اس کو رے کا غد کو چھڑنے کی کسی میں ہمت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اگر وہ اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر سامنے کی چھت پر کھڑی ہوئی عورت کی طرف نگاہ التفات سے دیکھ بھی لے تو وہ عورت اتنا بھی نہیں کرے گی کہ دوپٹہ کا پلو ہی سر پر لے لے۔ یا آنکھیں چرا کر دوڑتی ہوئی، گھر کی سیڑھیاں ہی اتر جائے۔ اگر وہ بن ٹھن کر گھر کے دروازے سے باہر نکلے۔ تو گلی محلہ میں بیٹھی ہوئی عورتیں اسے احترام سے تو دیکھ سکیں گی۔ لیکن چونک کر نہیں ذرا سی جنبش یا ذرا سی لرزش بھی تو پیدا نہیں ہو سکے گی۔ لیکن میں۔ بس یوں جیسے گلی میں سے کوئی بے چارہ، شریف سا گائے کا بچھڑا چلا جا رہا ہو۔ اور زبان حال سے کہہ رہا ہو۔ ”اگرچہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ کہ میرے گلی میں اترنے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ لیکن اس میں تمہارا بھی کیا قصور ہے۔ تمہارے دلوں کی دھڑکنوں کو نیز کرنے کے لئے میری کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔“

سیاسی اعتبار سے شاید وہ کسی بھی مددِ شہ فکر کا فائل نہیں ہے شاید یہ فیصلہ میں نے اس لئے کیا کہ وہ اپنی گفتگو میں سنجیدگی اور یقین کا رنگ لانے ہی نہیں دیتا۔ آپ اس کے ساتھ سیاست پر گفتگو کریں۔ تو وہ اسے مذاق میں اڑانا شروع کر دیگا۔ لیکن اس مذاق میں بھی اگر کوئی آدمی یہ اندازہ لگانا چاہے کہ جو ہنی اسے کیوں کی سیاسی گفتگو

بال و پر

کنہیا لال کپور

پبلشرز

لاجپت رائے اینڈ سنز
اردو بازار دہلی

میں کسی ایک لمحے کے لئے بھی قدرے اعتماد اور عنایت کی جھلک مل جائے۔
 تو وہ اس کے اصلی سیاسی رجحان کو سمجھ سکے۔ تو وہ ناکام رہے گا۔
 کیونکہ کپور اسیا موقعہ آنے ہی نہیں دیتا۔ میں نے خود کوئی مرتبہ یہ اندازہ
 لگانے کی کوشش کی۔ مگر کپور کی طرار مزاجی اور سیلابی مذاق نے مجھے
 کسی مقام پر پھرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں نے کتنے ہی اندازے
 لگا لگا کر چھوڑ دیے۔ کبھی میں سوچتا کہ اس نے ایک نہایت ترقی پسندانہ
 بات کہی ہے۔ اس لئے وہ شاید کمیونزم کا حامی ہوگا۔ کبھی سوچتا۔ ہاں
 اب وہ ذرا ذرا سوشلزم کی طرف جھکتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ کبھی
 سوچتا وہ ہندو سبھا کے متعلق باتیں کرتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے وہ
 کانگریسی خیالات رکھتا ہو کبھی مسلم لیگ کی تحریک پر تبصرہ کرتے ہوئے
 اس کا جھکاؤ اشتراکیہ سنگھ کی طرف دکھائی دینے لگتا۔ لیکن
 نتیجہ ہمیشہ صفر ہی نکلتا۔ وہ ہر تحریک پر تبصرہ کرتا اور یوں جیسے
 ان سبھوں کو چٹکیوں میں اڑاتا ہو۔ اس لحاظ سے
 اس کی یہ غیر جانبداری اسے بورژوا سیاست گری کا ہتھیار بنالیتی
 ہے۔

مذہب کے متعلق کپور کے خیالات دو تین فقروں میں سموئے جا
 سکتے ہیں۔ آپ اس کی ہیئت کذاتی دیکھیں۔ جبکہ اس نے
 مخصوص دھوتی پہن رکھی ہو۔ تو کوئی مہاپنڈت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن
 ”پنڈتائی“ سے وہ اتنا ہی دور ہے۔ جتنا کوئی کافر خدا سے ہو سکتا ہے

اور خوفناک خبریں آکر سناتے۔ لیکن اس کے چہرے پر شکن تک نہ آتی۔
 جیسے وہ تاریخ کے اس عظیم ترین حادثے کو صرف ایک مذاق سمجھ رہا ہو۔
 ممکن ہے اس لہزدہ خیز وقت میں جب کہ فسادوں سے ہر لمحہ خطرہ کا
 امکان ہو سکتا تھا۔ وہ رات کے کسی لمحے میں بیوی کے دباؤ پر چند
 ایک منٹ کے لئے سوچ لیتا ہو۔ کہ ہاں! انہیں جان بچا کر بھاگ
 جانا چاہئے۔ لیکن عام طور پر اس کی پیشانی متبسم رہتی۔ شاید کہنا چاہتا
 ہو۔ کہ موت سے ڈرنا کس قدر بے معنی ہے۔ انسانی بربریت سے
 گھبراتا جہالت ہے۔ اگر وہ مر بھی جائیگا۔ تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑیگا۔
 ہنر زندگی اس قدر کشش انگیز اور جاذب چیز تو ہے نہیں کہ اس
 کی خاطر اپنی اطمینان بخش مسکراہٹ کو بھی مار دیا جائے۔
 اس لئے پورے بیان کے مطابق اس نے اپنا سامان کئی مرتبہ باندھ باندھ
 کر گلی میں لا رکھا۔ اور شام کو پھر اندر لے گیا۔ اور کھول دیا۔ صبح پھر باندھ
 کر گلی میں لا رکھا اور شام کو پھر اندر لے جا کر کھول دیا۔ اور
 بالآخر جب وہ گھر چھوڑ کر ایک ٹرک پر سوار ہوا۔ تو اپنی قیمتی سے قیمتی
 کتابوں کے ٹرنک گھر ہی پر چھوڑ آیا۔ کیونکہ اس کی بیوی کی نگاہیں
 کہہ نہ ہی تھیں۔ گھر لیو برتن، بستر اور کپڑے ان کتابوں سے نہ یا وہ
 کارآمد چیزیں ہیں۔ چنانچہ اس نے بیوی کی نگاہوں کو اپنی خواہشات
 کا مرکز بنالیا۔ اور کتابوں کے بجائے گھر کا سامان ہمراہ لے آیا۔
 لاہور جیسے مہذب، مکمل، رنگین اور ہنگامہ خیز شہر کو چھوڑ کر وہ کہاں

چلا گیا؟ کتنے ہی مہینوں تک کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ کہ کپور کہاں گیا ہے۔
 نہ جالندھر میں نہ دہلی میں نہ شملہ میں۔ کیا وہ کسی دور دراز گاؤں میں
 چلا گیا ہوگا؟ میں نے سوچا اس سفر سے کوئی بعید نہیں کہ وہ کسی
 ایسے ہی اوٹ پٹانگ مقام پر چلا گیا ہو۔ جہاں بقول غالب ع
 ”کوئی ہمایہ نہ ہو اور پاساں کوئی نہ ہو“

ایک دن پرکاش پنڈت نے مجھے بتایا کہ کپور موگا میں ہے۔ یا
 مظہر العجاائب کتنا کوتاہمت شخص ہے یہ۔ موگا؟ بھلا یہ بھی کوئی رہنے کی
 جگہ ہو سکتی ہے؟ لیکن پھر میں نے سوچا کہ اس کی کوتاہمتی، ہمتی، ہماہمی سے
 بیزاری اور فسادات کی وحشیانہ حرکات نے اُسے اور بھی بھاگ کر رکھ دیا
 ہوگا۔ وہ پہلے بھی کچھ کم بختی ہوئی شخصیت نہیں تھا۔ بقول کرشن چندر
 وہ ایک قبر تھا۔ جس پر پھول چڑھنے کے بھی کوئی نہیں آئے گا۔
 اسی لئے وہ لاہور چھوڑ کر موگا کے قبرستان میں جا بسا۔ موگا جہاں کو سول
 تنک ادب، کلچر، سوسائٹی، علم، آرٹ کی پرچھائیں تک دکھائی نہیں
 دیتی۔ وہاں وہی چند بندھے، ٹکے، سکڑے سمٹے پروفسر ہونگے۔
 دیکھتے مجھے طالب علم ہونگے۔ اور کپور کے NOTES ہونگے۔ اور بس
 وہ قہقہے اور چیخے جن سے لاہور کی ادبی اور کلچرل فضا میں معمور رہتی
 تھیں۔ کپور ان سے دامن چھڑا کر گوشہ عافیت میں جا بسا ہے۔ اگرچہ
 وہ اب بھی سوچتا ہے کہ اس نے اچھا نہیں کیا۔ لیکن یہ سوچنے کے
 باوجود وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ مدافعت اور مقابلہ کی قوت سے تو وہ ازلی

طور پر محروم ہے۔ اس لئے اسے ایسا کرنے پر مجبور ہو جانا پڑا۔ وہ شاید زندگی سے بھاگ کر پناہ ڈھونڈ چکا ہے۔ شاید اس میں یہ عزت نہیں کہ ملازمت کے لئے سفارش اور رشوت مہیا کر سکے۔ مکان کے لئے الاٹمنٹ آفیسروں سے لڑ جھگڑ سکے۔ ادنیٰ محاذ میں دوبارہ اُلجھ سکے۔ اور کسی کلچرل شہر کی ہنگامہ خیز زندگی میں اپنے آپ کو بھونک دے۔

لیکن ————— اس فرار کے باوجود وہ اپنی فطرت کے طنزیہ بھاء کو مار نہیں سکتا۔ وہ لاکھ ایک امن پسند شہری ہی، لاکھ ایک شریف اور بندھاٹکا خاوند ہی۔ لیکن موگا جیسے بے جان کینج تنہائی میں جا کر بھی وہ ادب اور تمدن سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکا۔ موگا میں بیٹھ کر ہی اس نے پھر طنزیہ مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ اور ایک بار پھر زندگی کے ساتھ نئے نئے مذاق کرنے لگا۔ آج بھی اگر اُسے کہیں سے کسی مشاعرے یا ادبی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی جائے تو اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو گھریلو معاملات میں کھو جانے کی سنگین کوشش کر کے اپنے دل کی اس دھڑکن کو بند کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہی دھڑکن تو اس کی زندگی کا اڑھنا بچھونا ہے۔ وہ اسے کیونکر روک سکتا ہے۔ گزشتہ دنوں جب میں نے اُسے جالندھر کے ایک مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی۔ تو اس نے لکھا۔

”میری ساس مر گئی ہے۔ کالکا جا رہا ہوں۔“ اور تم جانتے ہو۔ کہ یہ کم نخت ساسیں روز تو مرنا نہیں کرتیں۔ اس لئے تمہارے

مشاعرے میں شرکت سے محذور ہوں :-

ساس تو مرتی رہی۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ وہ ہمارے مشاعرے کی صدارت کے لئے جالندھڑ آدھمکا۔ یہاں تک کہ اس نے اسٹیشن پر اپنے استقبال کی بھی پروانہ کی۔ اور بغیر ہمارا انتظار کئے میرے گھر آ رہا۔ اور پھر رات کے تین تین بجے تک ہم لوگ کپور کے وہی مانوس قہقہے وہی بے ساختہ مسکراہٹیں پھبتیاں اور طنزیہ جملے سنتے رہے۔ وہ متواتر بولتا رہا۔ ادب پر۔ آرٹ پر۔ سیاست پر۔ ادبی شخصیتوں پر گہری اور نفیس چوٹیں کرتا رہا۔ ہم سب کو جماہیوں پر جماہیاں آتی رہیں۔ لیکن وہ ان جماہیوں کی پروانہ بغیر تین بجے رات تک چمکتا رہا۔ جیسے اسے پھر نئی زندگی مل گئی ہو۔ جیسے اسے پھر اپنا پرانا مقام مل گیا ہو۔

وہ ایک بہت بڑا سکیم باز بھی ہے۔ عمل سے گریز اور فرار نے اسے ذہنی عمل کا راستہ سمجھا دیا ہے۔ اس لئے اس کا ذہن سکیمیں تیار کرتا رہتا ہے۔ یہ سکیمیں نہایت عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہ سکیمیں بیان کرتے وقت وہ ذرا بھر بھی سنجیدہ دکھائی نہیں دیتا لیکن اگر اس گفتگو میں سے مذاق کے عنصر کو نکال دیا جائے۔ تو اس کی سکیموں میں ایک جہت اور خاص عملی رنگ بھی ہوتا ہے۔ لاہور کے کئی ادبی پبلشر اس کی سکیموں کے والا و شیرا رہے ہیں۔ یہ سکیمیں اس کے دماغ میں پوری اور مکمل شکل میں کبھی نہیں آتیں۔ بلکہ سب سے پہلے مذاق

کے طور پر وہ صرف ایک تجویزی فقرہ بولتا ہے۔ اور پھر وہی تجویزی فقرہ اس کے دماغ میں پھیلتا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ بولتا چلا جاتا ہے۔ اور فقرہ بھی پھیلتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک بہت بڑی سکیم کے روپ میں ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے۔ بات سے بات کرنے کے فن کا وہ ماہر ہے۔ اور ان باتوں کے دوران میں اس کے چبھتے ہوئے جملے اس کی سکیم پر جلا کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی اس سکیم کو طنز کے تخریبی انداز میں پیش کرتا رہتا ہے۔ اور گویا اس کا تخریبی انداز کہہ رہا ہوتا ہے کہ ع

”مری تعمیر میں مضمحل ہے اک صورت خرابی کی“

وہ تخریب کے زاویہ سے تعمیر کی راہ دکھاتا ہے۔ کیونکہ اس نے زندگی کو ہمیشہ اسی زاویہ سے دیکھا ہے۔ اور اسی زاویہ سے پیش کرنا ہی اس کے فن کا خاص رنگ ہے۔

ادبی اعتبار سے وہ شیفسن سن سے مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن اسے جب یہ خیال آتا ہے کہ شیفسن سن تپدق سے مرا تھا۔ تو اس کی مشابہت سے قدرے گھبرا جاتا ہے۔ اور سوچتا ہے۔ وہ شیفسن سن کبھی نہیں ہے۔ ————— حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس گھبراہٹ کے باوجود اسے شیفسن سن کی آخری ردایت یعنی تپدق سے بھی ضرور تعلق رکھنا پڑیگا۔ ————— اس کا خیال ہے کہ اردو ادب میں باوجود اس درجہ ترقی پسندی کے غوغا کے ابھی بات نہیں بنی۔ ادب اگر بلند پایہ نہیں تو کچھ بھی

نہیں۔ کیونکہ ایک تاج محل، سینکڑوں جھونپڑیوں پر بھاری ہے۔
 تاج محل دالی تشبیہ اگرچہ خوبصورت ضرور ہے۔ لیکن میرا خیال ہے
 کہ مگر میں کپور کی تشبیہ پر کیوں بحث کر کے سرکھپاؤں۔
 کیا اس سرکھپائی سے سینکڑوں جھونپڑیاں تاج محل میں بدل جائیں گی؟
 پُرانے شاعروں میں سے اسے غالب سے عشق ہے۔ اسے صرف
 غالب ہی کے شعر یاد ہوتے ہیں۔ غالب جیسے سنجیدہ شاعر کے کلام کو
 کپور جیسے پھکڑ اور طنز نگار کے ہاں دیکھ کر تعجب تو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن
 کپور کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ اپنی طنزیہ گفتگو میں غالب کے
 شعروں کے حوالے کچھ اس طرح دے جاتا ہے۔ کہ یوں محسوس ہونے لگتا
 ہے جیسے غالب کے شعروں کی سنجیدگی پر کپور کے طنزیہ حوالوں نے ڈاکہ
 ڈال لیا ہے۔ اور غالب نے شاید کپور کی ڈاکہ زنی کے لئے ہی اپنا سارا
 دیوان ترتیب دیا تھا۔ اس کے مضامین کے سب سے پہلے مجموعے کا نام
 بھی غالب ہی کے دیوان سے لیا گیا تھا۔ یعنی ”سنگ و خشت“ اس کے
 بعد سنگ و خشت کی رعایت سے جب اسے غالب کے ہاں سے دور
 کوئی ترکیب نہ مل سکی۔ تو اس نے غالب کے دیوان کی اس افسوسناک
 کمی کو خود ہی پورا کر دیا۔ اور اپنے دوسرے مجموعے کا نام بھی ”سنگ
 و خشت“ کی تقلید میں ”شیشہ تیشہ“ اور ”چنگ در باب“ ہی رکھے۔
 اور غالب پرستی کا یہ تقلیدی سلسلہ مرتے وقت تک اس کا پیچھا نہیں
 چھوڑے گا۔

کرشن چندر کی طرح اس نے چند دنوں تک فلمی ماحول کا رخ
 ضرور کیا تھا۔ اس کے لئے اس نے بھٹی اور کلکتہ کا سفر بھی کیا تھا۔
 لیکن اس سفر سے اسے کچھ حاصل نہ ہوا۔ سوائے ایک دو مضامین
 کے جو اس نے ان شہروں پر لکھے۔ ورنہ دو ایک فلموں کے جو مکالمے
 اس نے لکھے ان میں تو فلم کے ڈائریکٹروں، فلم کی خوبصورت ہیروئینوں
 اور پروڈیوسروں کے محبوب ڈرائیوروں نے ہی تبدیلیاں کر کر کے
 ان کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اور جب فلم کی شوٹنگ کے وقت پور کو اسٹوڈیو
 میں لے جایا جاتا۔ تاکہ وہ صحیح مکالمے کی نگرانی کر سکے۔ تو پور سوائے
 اس کے اور کچھ نہ کرتا۔ کہ وہاں سیٹ پر فلم کے ڈائریکٹر۔ ہیروئن اور
 پروڈیوسر کے ڈرائیور کے حین مذاق پر عیش عیش کرتے تھے۔ اور انہیں داد
 دے دے کر کہتا۔ کہ آپ نے اس ڈرامے کے فلاں مکالمے اور فلاں فقہے
 کو بدل کر اس میں چار چاند لگا دئے ہیں مجھے آپ کی اس تبدیلی پر
 نات ہے۔

آج کل اس نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ آئندہ کسی بھی فلم کے
 مکالمے نہیں لکھے گا۔

سبز باغ

مجھ سے ملے۔ میرا نام خیر چھوڑیے۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ میرا شغل؟ میرا شغل لوگوں کو سبز باغ دکھانا ہے۔ حیران مت ہو جائے آخر ہم میں سے ہر ایک یہی کچھ تو کرتا ہے۔ لیڈر بھولے بھالے عوام کو سبز باغ دکھاتا ہے۔ عاشق محبوبہ کو۔ ڈاکٹر مریض کو ٹیکنیک میرا یہ ہے کہ میں ہمیشہ ان لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ جو زندگی سے نالاں اور جن سے زندگی نالاں ہے۔ باتوں باتوں میں بے تکلفی کی فضا پیدا کرنے کے بعد انہیں عجیب و غریب مشورے دینے لگتا ہوں۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ پانچ میں سے کم از کم تین میرا مشورہ قبول کر لیتے ہیں

”آپ پروفیسر ہیں“ میں کسی خستہ حال پروفیسر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہتا ہوں۔ ”اماں پروفیسری بھی کوئی پیشہ ہے۔ اُدھنی

تعداد ۱۱۰۰

۱۹۵۲ء
قیمت دو روپے آٹھ آنے

بار اول

دکان پھیکا پکوان یعنی نام بڑا درشن چھوٹے! مہینہ بھر کالج میں بکواس
 کیجئے اور تنخواہ صرف ایک سو پچاس روپے۔ یعنی اگر حساب لگایا جائے۔
 تو فی لیکچر ایک روپیہ! آپ سے زیادہ تو مسمریزم کا کھیل دکھانے
 والے کہا لیتے ہیں۔ جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے۔ اور پھر آپ کا
 مستقبل کیا ہے۔ ذرا اس پر بھی غور کیجئے۔ تیس برس ملازمت کیجئے اور
 پھر چھپکے سے ریٹائر ہو جائیے۔ اور اس کے بعد؟ سڑکیں ناپٹے ہو
 کھائیے۔ فیشن تو آپ کو ملنے سے رہی۔ بڑا زور ماریئے۔ تو کسی خیراتی
 شفا خانے میں داخل ہو جائیے۔ اور دق زدہ پھپھڑوں کا علاج کرائیے۔
 آپ نے یہ بھی سوچنے کی زحمت کی کہ ہمارے سماج میں ایک پروفیسر
 کی وقعت کیا ہے۔ لونڈے لونڈیاں آداب تک تو بجا نہیں لاتیں۔
 بازار میں کسی لونڈے سے ملاقات ہو جائے تو وہ شرم سے سر جھکا لیتا
 ہے۔ کرے بھی کیا بچا را۔ پھٹی ہوئی تیلون۔ میلا کوٹ اور لٹی فیلٹ پہنے
 پروفیسر صاحب جا رہے ہیں۔

یہ آپ کو سوچھی کیا۔ کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ پروفیسر بن بیٹھے
 صاحب اگر فلم انڈسٹری میں جاتے۔ ریڈیو کے محکمے میں ہوتے۔ کوئی بات
 بھی تھی۔ میری بیسیوں پروفیسروں سے شناسائی ہے۔ ان میں سے
 اکثر پڑھتے پڑھاتے بینائی سے محروم ہو چکے ہیں۔ جب ملتے ہیں۔
 کہتے ہیں۔ "میاں تم نے اچھا کیا۔ پروفیسر نہ ہوئے۔ ورنہ دنیا کے بہتے
 نہ دین کے۔ خیر صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے

میری مانتے۔ تو آج ہی استعفا دے دیجئے۔ کسی فلم کمپنی میں کوشش
کیجئے۔ آپ کی لیاقت سے مرعوب ہو کر درجنوں کمپنیاں آپ کو ملازم
رکھ لیں گی۔ ایک بار فلم انڈسٹری میں پہنچ گئے۔ بس پھر مزے ہی مزے
ہیں۔ شاندار کوشش میں رہتے گا۔ موٹر میں گھومنا کیجئے گا۔ اور روپیہ
اتنا کمائیے گا کہ آپ کی سات پشتیں اُسے آسانی سے ختم نہ کر سکیں گی۔
”اغاہ! آپ وکیل ہیں۔ تبھی یہ حالت بنا رکھی ہے۔ بخدا (معاف

کیجئے گا) دُور ہی سے نہیں، نزدیک سے بھی اچھے خاصے کباڑی نظر
آتے ہیں آپ۔ وکیل صاحب وہ دن لد گئے۔ جب خلیل خاں ناخستہ اڑایا
کرتے تھے۔ یعنی جب وکیل وکیل ہوتے تھے۔ آج کل تو دکالت صرف
دُور کے ڈھول ہو کر رہ گئی ہے۔ آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا جاتی
ہیں۔ اوپر کل نظر نہیں آتا۔ آپ کس سے لائق آدمی کو تو انشورنس

ایجنٹ ہونا چاہئے تھا۔ بس دارے نیارے ہو جاتے۔ مہینے بھر میں
اگر ڈیڑھ سو کس بھی کمپنی کو دیتے۔ تو دو ہزار کمیشن بنتی۔ آپ بن بیٹھے
وکیل۔ آمدنی صفر۔ خرچ بے حساب۔ نتیجہ پریشانی۔ اسی وکیل صاحب!
دکالت بھی کسی قسمت داغ کی چلتی ہے۔ ورنہ اکثر تو گھر سے کچری اور
کچری سے گھر کے چکر میں ہی پڑے رہتے ہیں۔ آپ تو خواہ مخواہ اپنا
وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہزاروں ایسے کام ہیں جو آپ کر سکتے ہیں۔
لیکن کرنا نہیں چاہتے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ دکالت کا چسکا جو پڑ گیا
ہے۔ بس اس پر اترا رہے ہیں۔ کہ لوگ آپ کو وکیل صاحب کہتے ہیں۔

ارے بھئی، دو گول کا کیا ہے۔ اگر آپ وکیل کے بدلے ڈاکٹر ہوتے۔ تو آپ کو ڈاکٹر صاحب کہہ دیتے۔ سوال تو یہ ہے کہ اوسطاً آپ کے پلے کیا پڑتا ہے۔ میرا تو اندازہ ہے۔ شکل سے پچاس روپے۔ پچاس روپے! یہ رقم تو آپ ایک مضمون لکھ کر کما سکتے ہیں۔ لعنت بھیجئے وکالت پر۔ مضمون لکھا کیجئے۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ روپیہ الگ آئے گا۔ اور نام مفت میں چمک جائیگا۔ ایک بار بہت سے کام لے کر وکالت کا لائسنس منسوخ کرا لیجئے۔ پھر فلاں حد کی شان دیکھئے۔ کیا کہا آپ نے۔ وکالت نہیں چھوٹی۔ بھئی خوب۔ وکالت نہ ہوئی۔ دختر رز ہوئی۔ آپ کچھری جانا بند کیجئے۔ وکالت اپنے آپ چھوٹ جائے گی۔

”آپ کلرک ہیں۔ اسے کہتے ہیں قدرت کی ستم ظریفی۔ بھلا آپ کو دیکھ کر کوئی کیسے مان لے کہ آپ کلرک ہیں۔ بخدا بھلے چنگے بلکہ خاصے انسان نظر آتے ہیں۔ قدر و قامت مناسب ہے۔ شکل و صورت بھی بُری نہیں آپ کو کس بے وقوف نے مشورہ دیا۔ کہ کلرک بن جائیے۔ کلرک کی تو قید بامشقت ہے۔ قید محض بھی نہیں۔ سارا دن دفتر میں بیٹھ کر جھک مارئے۔ افسروں کی گھرکیاں سہیئے۔ اور رات کو فائیلوں پر جھک جھک کر اپنی صحت تباہ کیجئے۔ بندہ پرور! آپ کس منحصر میں پھنس گئے۔ دیکھئے اپنا سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ ورنہ مجھے کیا ضرورت کہ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑاؤں۔ کلرک سے بدتر انسان میرے

دیکھنے میں نہیں آیا۔ اعداد و شمار سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تپ دق کے
 اسی فی صدی مریض کلرک ہوتے ہیں۔ یعنی کلرکی تپ دق کا دوسرا نام ہے۔
 ایک لمحہ کے لئے سوچئے۔ خدا نخواستہ آپ کو دق ہو جائے۔ آپ کے متعلقین
 کا کیا بنے گا۔ یہی ناکہ وہ بے چارے گھل گھل کر مر جائیں گے۔ میں نے سنا
 ہے آپ شاعر بھی ہیں۔ ہانا ہا۔ کلرک اور شاعری ابھلا آپ خاک شعر
 کہتے ہونگے۔ شعر کہنے کے لئے فراغت چاہئے۔ فرصت کے رات دن ایساں
 نہ دن تمہارا نہ رات تمہاری..... دیکھئے آپ کو راز کی بات بتاؤں۔
 آج کل لائڈری کا کام بہت نفع بخش ہے۔ چپکے سے لائڈری کا پلانٹ
 خرید لیجئے۔ اور اسے ایسی جگہ لگائیے۔ جہاں آمد و رفت عام ہو۔ بس
 کپڑے صاف کیا کیجئے۔ اور شعر کہا کیجئے۔ اگر راتوں رات امیر نہ بن جائیں
 تو میرا نام بدل دیجئے گا۔ لائڈری تو بندہ نواز اللہ دین کا چرخہ ہے۔ یہی
 افسر لوگ جو آپ پر رعب گانٹتے ہیں بھاگم بھاگ آئیں گے اور گر گر کر
 کہیں گے۔ ”منہ مانگے دام لیجئے۔“ لیکن اس سوٹ سے نیلی روشنائی کے
 دھبے دور کر دیجئے۔“ بخدا اس وقت تنگنے دام طلب کیجئے گا۔ اور دل
 ہی دل میں خوش ہو کر کہنے گا۔ ”کیوں صاحب بہادر! بڑا رعب جھاتے
 تھے ہم پر۔ آج چڑھے نا ہمارے ہتھے۔ کہو تو یہ سوٹ تباہ کر کے رکھ
 دوں“.....

..... اور جب یہ لوگ میرے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے
 پروفیسری و کالت یا کلرکی چھوڑ کر بے کار ہو جاتے ہیں۔ اور تا بڑا توڑ

کوششوں کے باوجود بہتر ملازمت حاصل کرنے میں ناکامیاب رہتے
 ہیں اور نہایت مایوسی کے عالم میں میرے پاس آکر شکایت کرتے ہیں۔
 کہ انہیں ہر دروازے سے بے نیل و مرام واپس آنا پڑا ہے۔ تو میں
 انہیں پہلے سبز باغوں سے زیادہ دلکش سبز باغ دکھانے لگتا ہوں۔
 ”آپ کو کسی فلم کمپنی نے ملازم نہیں رکھا؟ مجھے ذرا بھر بھی تعجب نہیں
 آپ پر وفیسر ہیں۔ پڑھے لکھے سمجھ دار آدمی ہیں۔ لکھنے کا فن جانتے
 ہیں۔ بس یہی آپ کا سب سے بڑا جرم ہے۔ اگر آپ ان پڑھ ہوتے۔
 آپ کا مذاق از حد سبت ہوتا۔ آپ صحیح زبان لکھ نہ سکتے۔ تو آپ کو فوراً
 ملازم رکھ لیا جاتا۔ خیر یہ بھی اچھا ہوا۔ کہ کام کے عوض آپ کو ”جواب“
 ملا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ بسکٹ فیکٹری قائم کر لیجئے۔ زیادہ
 سرمائے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے۔ دو تین ہزار سے کام چل جائیگا۔
 آپ تو پر وفیسر رہے ہیں۔ سینکڑوں طلباء آپ کو جانتے ہوں گے۔ اور
 طلباء کو بسکٹ کھانے کا جو شوق ہوتا ہے۔ وہ آپ سے مخفی نہیں دیکھتے
 اگر آپ پانسویں سے تین سو طلباء بھی آپ کے مستقل گاہک بن جائیں۔
 تو آپ ایک ہزار روپیہ ماہوار کماسکتے ہیں۔ یہ کام آپ کو پسند نہیں
 غضب کرتے ہیں آپ! معلوم ہے آپ کو ڈی ڈی۔ ڈووانی نے
 اسی کام سے لاکھوں کمائے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ بسکٹ بنانے
 سے پہلے وہ ایک معمولی سکول ماسٹر تھا۔ اگر ایک سکول ماسٹر جس کی
 ذہانت آپ کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے لکھ پتی بن سکتا ہے۔

تو آپ کیوں نہیں بن سکتے۔ اچھا چھوڑیے۔ میں آپ کو اس سے بہتر کام بتاتا ہوں۔ آپ اخباروں کے لئے اشتہارات اکٹھا کیا کیجئے۔ اگر ایک ماہ میں آپ پچاس ہزار کے اشتہارات فراہم کر لیں۔ تو ان پر آپ کو پچیس فی صد کمیشن ملے گی۔ یعنی ساڑھے بارہ ہزار۔ اسے کہتے ہیں ہینگ ٹکے نہ پٹکڑی۔ بڑی بڑی فرموں کے پاس جاتیے۔ موٹروں کی فرمیں ہیں۔ چائے کی فرمیں ہیں۔ دواؤں کی فرمیں ہیں۔ اور ہاں فلم انڈسٹری ہے۔ پچاس ہزار کے اشتہارات حاصل کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ کام بھی آپ نہیں کرنا چاہتے؟ تعجب! اچھا تو پالتو کتے بیچنے کا کام کیسا رہے گا؟ مانا کہ انگریز چلے گئے ہیں۔ راجاؤں اور نوابوں کا دور ختم ہوا۔ لیکن پالتو کتوں کے اب بھی ہزاروں گاہک ہیں۔ کہیں سے اچھی نسل کے چند کتے لے آئیے اور پھر ہندوستان کے ہر اخبار میں اشتہار دے ڈالئے کہ بہترین نسل کے کتے صرف آپ سے مل سکتے ہیں۔ ایک ایک کتے کے دو دو ہزار وصول کیجئے۔ اگر دس کتے بھی یک جا یں۔ تو بیس ہزار روپیہ آپ کی جیب میں آ جائے گا۔ آپ ناک بھول چڑھا رہے ہیں۔ یہ کام بھی ناپسند ہے۔ اچھا تو آپ یوں کیجئے۔ کسی امیر بیوہ سے شادی کر لیجئے۔ آرام سے زندگی بسر ہوگی۔ اور گلچمرے اڑائیے گا۔ آپ شادی شدہ ہیں؟ اتنی جلدی آپ نے شادی کی ہی کیوں؟ خیر تو آپ یہ کیجئے۔ کہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جتنی لائبریاں نکلنے والی ہیں۔ ان سب کے ٹکٹ خرید لیجئے۔ آخر کوئی تو آپ کے نام نکلے گی۔ ٹکٹ خریدنے کے لئے آپ کے

پاس پیسے نہیں؟ اچھا تو آپ یہ کیجئے۔۔۔۔۔ یہ کیجئے۔۔۔۔۔
یہ کہ۔۔۔۔۔ دراصل اس وقت دماغ کام نہیں کر رہا۔ آپ کسی اور
وقت تشریف لائیے۔ میں سوچ کر تباؤ لگا۔ بہر حال مایوس ہونے کی قطعی
ضرورت نہیں۔

۔۔۔۔۔ اور پھر کسی دن جب میں انہیں طرح طرح کے
سبز باغ دکھا رہا ہوتا ہوں۔ تو وہ کسی باغ کی خوبصورتی و رعنائی سے
مرعوب ہو کر خوشی سے ناچنے لگتے ہیں۔ لیکن جب سبز باغ آخر سبز
باغ ثابت ہوتے ہیں۔ تو وہ گھبرا کر پھر میرے گھر کا رخ کرتے ہیں۔
اور میں سبز باغوں کا سلسلہ از سر نو شروع کر دیتا ہوں۔ اردو اخباروں
کے لئے گپ شب کا کالم لکھا کیجئے۔۔۔۔۔ پن چکی لگا لیجئے۔
 فلمی رسالہ نکالئے۔۔۔۔۔ مرغی خانہ کھول لیجئے۔۔۔۔۔ کسی سیٹھ
کا متبنے بن جائیے۔۔۔۔۔ انڈیا مان چلے جائیے۔۔۔۔۔ بھٹی
میں چاٹے کی دکان کھول لیجئے۔
حتیٰ کہ تنگ آکر وہ سوچنے لگتے ہیں۔ کہ پروفیسری۔ وکالت اور
کلر کی تو ان سبز باغوں سے کہیں بہتر تھی۔

کاٹھ کا آلو

اب جبکہ سیٹھ کچھ مرل کی کامیابی کی خبر اخباروں میں چھپ چکی ہے۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بتادیا جائے کہ وہ ہمارے حلقے سے پارلیمنٹری انتخابات میں کامیاب کس طرح ہوئے۔ سیٹھ کچھ مرل عمرانیس سال (لیکن معلوم انچاس کے ہوتے ہیں) ایک آنکھ اصلی۔ ایک مصنوعی چہرہ لمبوتر۔ وضع قطع غیر شریفانہ۔ لباس عموماً غلیظ۔ جس سے لہسن اور ہیننگ کی مٹی جلی جاتی ہے۔ تعلیم صفر۔ پیشہ کوئلہ۔ چونا اور اینٹوں کی خرید و فروخت۔ سیٹھ صاحب موصوف ہمارے حلقے سے بطور آزاد امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ کسی پارٹی کے ٹکٹ پر اس لئے کھڑے نہ ہو سکے کہ پارٹی دفتروں کے بجائے یہ ڈاک خانوں اور ریلوے اور سینما ٹکٹ گھروں کے دروازے کھٹکھٹاتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ ایکشن

کے ٹکٹ ان جگہوں سے دستیاب ہوتے ہیں۔

یکم نومبر کی رات کے دو بجے جب ساری دنیا مزے کی نیند سو رہی تھی۔ سیٹھ صاحب کو الہام ہوا۔ کہ انہیں پارلیمنٹ کے لئے کھڑا ہونا چاہیئے۔ یہ الہام کچھ اس شدت سے ہوا کہ آپ اپنے بستر پر سر کے بل کھڑے ہو گئے۔ اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک کہ تھک کر پھر بستر پر نہ گر پڑے۔ دوسرے دن انہوں نے کاغذات نامزدگی داخل کر دائے۔ یہ اسی دن ۱۱ بجے کا ذکر ہے کہ آپ کی ملاقات مجھ سے سربراہ ہوئی۔ کچھ گھبرائے ہوئے سے نظر آتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”سیٹھ صاحب! کیا بات ہے؟“ بھنا کر کہنے لگے۔ ”عجیب مصیبت ہے یہ بھی۔“

”کیا عجیب مصیبت ہے؟“

”یہ الیکشن کے لئے نشان منتخب کرنا۔“

”آپ کو الیکشن سے کیا۔ آپ مزے سے کوئلہ بیچئے۔ نشان منتخب

کرنے والے کرتے رہیں گے۔“

”کوئلہ تو ہر روز ہی بیچتا ہوں۔ لیکن الیکشن تو روز روز نہیں آتے۔“

”خدا نخواستہ کہیں آپ الیکشن کے لئے تو کھڑے نہیں ہو رہے؟“

”ہو نہیں رہا۔ ہو گیا ہوں۔ ابھی ابھی کاغذات داخل کر کے آیا

ہوں۔“

”لیکن آپ اور الیکشن؟“

”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ جب چمڑا بیچنے والے۔ جوتا چرانے والے۔

بوٹ پالش کرنے والے الیکشن کے لئے کھڑے ہو رہے ہیں تو کوئی نیچے
والے سیٹھ کچھ مرل نے کیا پاپ کیا ہے کہ وہ ———
”بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اچھا ——— تو مبادک باد قبول
فرمائیے۔“

”مبارک باد تو بعد میں دیکھی جائے گی۔ پہلے یہ بتائیے کہ نشان
کون سا چنا جائے؟“
”کوئی بھی چن لیجئے۔ درجنوں نشان ہیں۔“
”مثلاً“

”ڈگڈگی کے متعلق کیا خیال ہے؟“
”نشان تو اچھا تھا۔ لیکن کم بخت مدرسی لال نے چن لیا۔“
”ریچھ“
”یہ بھی منتخب کیا جا چکا ہے۔“
”لنگور“

”اس کے متعلق تو دو امیدواروں میں خاصہ جھگڑا ہو چلا تھا۔
آخر قریعہ اندازی سے فیصلہ ہوا۔“
”بارہ سنگھا۔“

”یہ کوئی اچھا نشان نہیں۔“
”لگڈ بگڈ۔“

”بہت خوشنوار نشان ہے۔“

خواجہ احمد عباس کے نام

ۛ

کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں

میں نے سیٹھ صاحب کو بیسیوں نشان بتائے۔ لیکن انہیں کوئی پسند نہ آیا۔ آخر میں نے ان سے یہ کہہ کر رخصت چاہی کہ شام کو سوچ کر بتاؤں گا۔

سارا دن اسی اڈھیڑ بن میں رہا۔ کہ سیٹھ صاحب کے لئے کونسا نشان موزوں رہے گا۔ سیٹھ صاحب سے میری پرانی رسم و راہ تھی۔ اور میں نہیں چاہتا تھا۔ کہ انہیں مایوس کروں۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا۔ کہ ہاؤس کے کمرے سے لے کر دم کٹی گلہری تک۔ چمکاڈر سے لے کر کھٹل تک کوئی بھی ان کے لئے موزوں نہیں۔ میں نے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں صاف صاف کہہ دیا۔ کہ میں کوئی نشان تلاش نہیں کر سکا۔ وہ بہت رنجیدہ ہوئے۔ اُداس سے لہجے میں کہنے لگے۔ ”عجیب بات ہے۔ آپ جیسا پڑھا لکھا آدمی بھی کوئی نشان تجویز نہیں کر سکا۔“

”بات تو واقعی عجیب ہے۔ لیکن کیا بھی کیا جائے۔ کوئی بھی نشان آپ پر ٹھیک نہیں بیٹھتا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ انہوں نے ایسی آواز میں کہا۔ جس پر بیچ کا گمان ہوتا تھا۔ اور ساتھ ہی اپنی اصلی اور مصنوعی آنکھ سے میری طرف گھورنے کی کوشش کی۔ یک لخت مجھے محسوس ہوا۔ گویا میں اپنی زندگی میں پہلی بار ایک جیتے جاگتے اُکو کو اپنے سامنے بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ میں نے مسرت سے چلا کر کہا۔ ”بل گیا۔ سیٹھ صاحب۔ بل گیا۔“

”کیا ہے۔ مجھے بھی تو بتائیے“

”بخدا نہایت موزوں نشان ہے“

بتائیے بھی نا“

”کاٹھ کاٹو“

”کاٹھ کاٹو؟“

”ہاں۔ ہاں۔ کاٹھ کاٹو۔ بخدا نہایت مناسب نشان ہے۔“

”آپ مذاق تو نہیں کریں؟“

”بالکل نہیں۔ دیکھئے ناکتنا اچھوتا نشان ہے“

”اچھوتا۔ وہ کیسے؟“

”اچھوتا تو ہے ہی۔ لیکن اچھوتا ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی ہے۔“

کوئی دوڑ اس نشان کو آسانی سے بھول نہیں سکے گا۔“

”مگر کچھ عجیب سا۔۔۔۔۔۔“

”ذرا بھر عجیب نہیں۔ آپ شاید اس لئے کہہ رہے ہیں کہ ذرا

مزاحیہ ہے۔ لیکن سیٹھ صاحب! اس میں کوئی قباحیت نہیں۔ دوسرے

یہ صرف کاٹھ کاٹو ہے۔ اصلی یعنی گوشت پوست کاٹو نہیں اور آپ

جانتے ہیں کہ دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔“

سیٹھ صاحب کی تسلی نہ ہوئی۔ لیکن ایک گھنٹے کی بحث کے بعد

میں نے انہیں یہ نشان اپنانے پر رضامند کر لیا۔

”اچھا۔ اب یہ بتائیے۔ کہ الیکشن میں کامیاب ہونے کے لئے



**THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM**

**LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.**

کیا کچھ کرنا پڑے گا؟“ سیٹھ صاحب نے نہایت سنجیدگی سے سوال کیا۔
 ”بہت کچھ“
 ”پھر بھی“

”سب سے پہلے تو ایک ہوشیار سا پراسپیکٹڈ اسکیئرٹری تلاش کیجئے۔“
 ”اس کے بعد؟“

”اس کے بعد دو ٹروں کا اعتماد حاصل کیجئے۔“
 ”وہ کیسے؟“

”یہ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔“
 ”پھر بھی“

”بس کسی نہ کسی طرح انہیں یقین دلا دیجئے کہ آپ بہترین امیدوار
 ہیں۔“

”یقین تو دلایا جاسکتا ہے۔“

”تو پھر پیرامتا کا نام لے کر الیکشن کے میدان میں کود پڑیے۔“
 سیٹھ صاحب نے منشی قلم دین قلم ایڈیٹر قلمدان“ کو اپنا اسکیئرٹری
 مقرر کیا۔ اس سے انہیں دو فائدے ہوئے۔ ایک تو اخبار قلمدان“
 کے کالموں میں ان کا باقاعدہ پراسپیکٹڈ ہونے لگا۔ دوسرے ایک بہترین
 ادیب کی خدمات صرف ان کے لئے وقف ہو گئیں۔ منشی قلم دین قلم تکی
 ذہانت و بھاریت کا اندازہ ان دو پوسٹروں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔
 جو انہوں نے سیٹھ صاحب کے لئے تحریر کئے۔ پہلے اشتہار کا عنوان

تھا۔ ”اس لئے کہ“

”کاٹھ کے آٹو کو دوٹ دیجئے۔“

اس لئے کہ

”کاٹھ کا آٹو کاٹھ کا آٹو ہے۔“

اس لئے کہ

کاٹھ کا آٹو سیاست کو بالکل نہیں سمجھتا۔

اس لئے کہ

سیاست کے علاوہ بھی وہ کسی چیز کو نہیں سمجھتا۔

اس لئے کہ

اگر آپ اسے دوٹ دیں گے۔ تو ملک وہیں رہے گا۔ جہاں اب ہے۔

یعنی تنزّل کی طرف نہیں جائے گا۔

اس لئے کہ

”کاٹھ کا آٹو بہترین اُمیدوار ہے۔ کیونکہ اس سے بڑا کاٹھ کا آٹو کوئی

نہیں۔“

دوسرے اشتہار کی عبارت یہ تھی :-

”میں وعدہ کرتا ہوں

کہ پارلیمنٹ کا میرے بچے ہی

ہر بالغ و نابالغ کا راشن ملے گا۔

پانچ سال کے لئے کسی شخص پر انکم ٹیکس نہیں لگے گا۔

آٹے کا بھاؤ پندرہ روپے من سے پندرہ آنے من کرونگا۔
خالص گھی آٹھ آنے سیر ملے گا۔

گھروں میں جتنے چوہے ہیں۔ ان سب کو چُن چُن کر مروادونگا۔
اپنے حلقے میں ایک بھی آوارہ کتا نہیں رہنے دوں گا۔
ہر طالب علم کی فیس معاف کروادونگا۔
ہر پھوٹری کو خاوند کی مار پیٹ سے بچانے کا انتظام کرونگا۔
کسی بھی گندے نمے کو گندانا نہ نہیں رہنے دوں گا۔“

ان اشتہاروں کا دیواروں پر چسپاں ہونا تھا کہ سارے شہر
میں تہلکہ مچ گیا۔ تہلکہ مچنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اشتہار پردائیں طرف
سیٹھ صاحب کی تصویر تھی۔ اور بائیں طرف کاٹھ کے اُلو کی۔ لیکن ذہین سے
ذہین آدمی بھی یہ تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ کہ سیٹھ صاحب اور کاٹھ کے اُلو
میں کیا فرق ہے۔ یہ تصویریں مشہور آرٹسٹ ملو سنگھ نے کہ جو کلو سکول آف
آرٹ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بنائی تھیں۔ ان دونوں اشتہاروں کا عوام
پر بہت اثر ہوا۔ اکثر و بیشتر دھڑوں نے تسلیم کیا کہ سیٹھ صاحب نے
سیاست سے اپنی لاعلمی اور ناواقفیت کا اعتراف کر کے اعلیٰ درجہ کی اخلاقی
جرات کا ثبوت دیا ہے۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں“ کا جب مقابلہ دوسرے
امیدواروں کے وعدوں سے کیا گیا۔ تو ان کے سب وعدے بیچ نظر
آنے لگے۔ لیکن سیٹھ صاحب نے صرف اشتہاروں پر اکتفا نہیں کی۔ عوام
کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اپنی فرم ”کچھو مرایت سنز“ کی سلور

جوبلی منانے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ ان کی فرم کو قائم ہوئے مشکل سے پانچ سال ہوئے تھے۔ ایک نہایت پُر تکلف دعوت کی گئی۔ جس میں تمام سرکردہ ووٹروں کو مدعو کیا گیا۔ دعوت کے اختتام پر سیٹھ صاحب نے یہ اعلان کیا۔ ”میں اس مبارک موقع پر اعلان کرتا ہوں۔ کہ ہر دھرم استحقاق یعنی مندر مسجد۔ گوردوارے کی سفیدی اپنے خرچ اور اپنی فرم کے خالص چونے سے کراؤنگا۔ ہر دھرم استحقاق میں جتنا کوٹہ جلائے کے لئے درکار ہوگا۔ وہ بلا قیمت مہیا کرونگا۔ ہر دھرم استحقاق کی چار دیواری کی مرمت کے لئے جتنی اینٹوں کی ضرورت ہوگی ”کچومر اینڈ سنز“ ان کے لئے ایک پائی لینا بھی پاپ سمجھیں گے۔“

اس اعلان سے ان کے دھرماتما پن کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور جب واقعی انہوں نے شہر کے سب سے بڑے مندر میں بیس سیر کوٹہ بھجوا دیا تو دسمبر کی سخت سردی میں ٹھٹھرنے والے پجاری اور بھگت ان کے نام کی مالا بچنے لگے۔ پندرہ دسمبر سے پچیس دسمبر تک ہر روز سیٹھ کچومر مل کا جلوس نکالا گیا۔ ایک جیب میں جس کی اگلی سیٹ پر ایک بڑا درنی کاٹھ کاٹور کھایا تھا۔ سیٹھ صاحب کو بٹھایا گیا۔ ہزاروں تماشاخی کاٹھ کے اُتو کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے۔ شہر کے پانچ سکولوں کے طلباء کو مٹھائی کا لالچ دے کر سمجھایا گیا۔ کہ جلوس کے ساتھ ساتھ چلیں اور ہر پانچ منٹ کے بعد منشی قلم دین قلم کی لکھی ہوئی نظم مل کر گائیں :-

کاٹھ کا اُٹو - پیارا پیارا
 کاٹھ کا اُٹو - آنکھ کا تارا
 کاٹھ کا اُٹو - سب سے نیارا
 کاٹھ کا اُٹو - کبھی نہ مارا

شہر کے مختلف حصوں میں کاٹھ کے اُٹو کے حق میں جلے کئے گئے۔
 جن میں منشی قلم دین قلم کی لکھی ہوئی تقریریں پڑھی گئیں۔ عوام کو بتایا گیا۔
 کہ کاٹھ کا اُٹو پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہونے کے بعد اُن کے لئے کیا کیا کریگا۔
 قریب قریب ہر تقریر میں یہ بات دہرائی گئی۔ کہ گو کاٹھ کا اُٹو سیاست کی
 الف بے سے بھی ناواقف ہے۔ اسے کوئلہ۔ چونا اور اینٹیں بیچنے کا کافی
 تجربہ ہے۔ گو وہ عوام کے مسائل سمجھنے سے قاصر ہے۔ لیکن اُسے اس معاملے
 میں محذور سمجھا جائے۔ کیونکہ عوام کے مسائل اتنے پیچیدہ ہیں کہ کسی
 شخص کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ گو اُسے یہ معلوم نہیں کہ آیا دہلی ہندوستان
 کی راجدھانی ہے یا ہندوستان دہلی کی۔ اسے معاف کر دیا جائیگا۔ کیونکہ
 اس نے جغرافیہ بھی پڑھا ہی نہیں۔ ان تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے
 لوگ جو سیٹھ کو مرمل کو محض کوئلے کا تاجر سمجھا کرتے تھے اسے اعلیٰ درجے
 کا سیاست دان سمجھنے لگے۔ اور ان میں سے بیشتر کوئلہ بھی اسی سے خریدنے
 لگے۔

سیٹھ کو مرمل کے مقابلے میں صرف دو امیدوار تھے۔ ایکشن سے
 چند روز پہلے منشی قلم دین قلم نے ایک کو سیٹھ صاحب کے حق میں دستبردار

ہونے پر رضامند کر لیا۔ دستبرداری کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ منشی صاحب نے اُسے یہ بات ذہن نشین کرادی کہ اگر تم جیت گئے۔ تو لوگ کہیں گے کاٹھ کے اُلو کے مقابلے میں جینا ہے۔ اور اگر ہار گئے تو لوگ طعنہ دیں گے کہ کاٹھ کے اُلو نے ہرا دیا۔“

دوسرا امیدوار آخر دم تک ڈٹا رہا کہ نہایت سخت جان واقع ہوا تھا۔ اس کو سیٹھ صاحب کے مقابلے میں صرف پانچ فی صد ووٹ ملے۔ اور بیچارے کی ضمانت بھی ضبط ہو گئی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ تعلیم یافتہ تھا۔ ”سیاست کو سمجھتا تھا۔ شاید عوام کی خدمت بھی کر سکتا تھا۔ مگر اس کم سخت نے غلطی یہ کی کہ اپنا نشان ”ہما“ منتخب کر لیا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اپنے دیس میں ”کاٹھ کے اُلو“ کے مقابلے میں ”ہما“ کو کون پوچھتا ہے!

گرفتاری

اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ ایک ایسی دکان کے سامنے سے گزرا تھا جہاں
 دیکھا گیا تھا۔ چل "لال کتابیں" فروخت کی جاتی ہیں۔ غالباً اسے کسی سپاہی نے
 جس کی ڈیوٹی اس دکان پر کڑی نگرانی رکھنا تھی۔ دیکھا تھا۔ سپاہی نے اس سنسنی
 خیز واقعہ کی اطلاع تحصیل ہیڈ کوارٹر میں پہنچائی۔ تحصیل ہیڈ کوارٹر نے ضلع ہیڈ
 کوارٹر کو بندریہ تار مطلع کیا۔ ضلع ہیڈ کوارٹر نے کمشنری ہیڈ کوارٹر سے ٹیلیفون
 پر مشورہ کیا۔ کمشنری ہیڈ کوارٹر نے ہدایات بھیجیں کہ اس سے پیشتر کہ ملزم
 "انڈر گراؤنڈ" ہو جائے اسے گرفتار کر لیا جائے۔

دوسرے دن جب وہ دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک انسپکٹر
 صاحب جن کے ساتھ نصف درجن سپاہی تھے اس کے مکان پر وارد ہوئے۔
 اور انہوں نے اسے یہ دلچسپ خبر سنائی۔ کہ وہ تلاشی دینے کے لئے تیار ہو

فہرس

۹	پیش لفظ
۱۱	تعارف
۴۰	سبز باغ
۴۸	کاٹھ کا آؤ
۵۹	گرفتاری
۶۷	جانشین
۷۷	کھجور کا درخت
۸۴	نوٹ کر لیجئے
۹۲	رمضان یعنی مائادین یعنی جمنا
۱۰۰	پیغام

جائے۔

”تلاشی! اُس نے ذرا گھبرا کر کہا۔“ لیکن مجھ سے کون سا جرم سرزد ہوا ہے؟“

”یہ ہم آپ کو کیسے بتا سکتے ہیں۔ آپ کا جرم صیغہ راز میں ہے۔“ انسپکٹر صاحب نے روکھے پن سے جواب دیا۔

”ذرا اپنا کوٹ اتار دیجئے۔“ انسپکٹر صاحب نے اوپر کی جیب سے اس کا فونٹین پن نکالا۔ غور سے اس کا جائزہ لیا۔ اور اس کی رب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کی رب ضرورت سے زیادہ تیز معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ بیان کیجئے!“

”لکھنے میں اچھی رہتی ہے۔“

انسپکٹر صاحب نے کاغذ پر رب سے لکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ پن میں لال سیاہی کیوں استعمال کرتے ہیں؟“

”مجھے لال سیاہی اچھی لگتی ہے۔“

”ہمم!“ اور اس پر آپ کہتے ہیں کہ آپ سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا؟“ انسپکٹر نے سپاہیوں کی طرف ایک طنزیہ مسکراہٹ پھینکتے ہوئے کہا۔

کوٹ کی جیب سے ایک لاکٹ برآمد ہوا۔ اس میں ایک لڑکی کی

تصویر تھی۔

”یہ کس کی تصویر ہے؟“ انسپکٹر صاحب نے نہایت بخجیدگی سے پوچھا۔

”ایک لڑکی کی۔“

”اُس کا نام؟“

”اُس کا نام میں نہیں بتا سکتا۔ صیغہ راز میں ہے۔“

”مگر وہ ہے کون؟“

”ہے نہیں انسپکٹر صاحب! تھی اسے“

”یہ قصہ ہے تب کا جب آتش جوان تھا“

”آتش؟ آتش کون ہے؟“

”ایک شاعر“

”اس کا پتہ لکھوائیے۔“

”آتش لکھنوی عدم آباد۔“

”عدم آباد یو۔ پی میں ہے نا؟“

”نہیں۔“

”تو پھر کون سے صوبے میں ہے؟“

”اٹلس میں تلاش کر لیجئے گا۔“

ایک اور جیب سے سگریٹ کا ایک ٹکڑا نکلا۔ انسپکٹر صاحب نے

اسے انگلیوں میں مسلتے ہوئے پوچھا۔

”اس میں تمباکو ہی ہے نا؟“

”نہیں۔“

”اور کیا ہے؟“

”بارود!“

”آپ سگریٹ میں بارود استعمال کرتے ہیں؟“

”جی ہاں!“

”کس لئے؟“

”اپنے منہ کو بھک سے اڑانے کے لئے۔“

انسپکٹر صاحب ڈراکھیانے ہو کر تیسری جیب کی تلاشی لینے لگے۔

اس میں سے جیب گھڑی نکال کر انہوں نے ایک سپاہی سے کہا: ”ڈرا

اس گھڑی کو کھول کر دیکھو تو۔“

”گھڑی کس لئے کھولنا چاہتے ہیں؟“ اس نے ڈرائٹرز روٹی سے

کہا۔

”میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اس میں کوئی چیز تو نہیں چھپا رکھی۔“

”گھڑی میں کوئی چیز چھپائی جاسکتی ہے؟“

”ہزاروں چیزیں۔ مثلاً کاغذ کے پُرزے۔ خفیہ دستاویزیں۔“

”وائر لیس پیغام بھیجنے کا آلہ۔ ایک سپاہی نے اپنے افسر کی مدد کرتے

ہوئے کہا۔

گھڑی کھولی گئی۔ لیکن اس سے کوئی متوقع چیز برآمد نہ ہوئی۔ ”اچھا

اب گھر کی تلاشی دیجئے۔“ انسپکٹر صاحب نے ساتھ والے کمرے میں داخل

ہوتے ہوئے کہا۔

”اس میں کیا ہے؟“ انہوں نے ایک کنستری طرف اشارہ کرتے ہوئے

”تو چھا۔“

”مٹی کا تیل“

”مجھے تو اس سے تیزاب کی بو آتی ہے۔“ انسپکٹر صاحب نے کنستر پر جھکتے اور اُسے سونگھتے ہوئے فرمایا۔

”یہ آپ کی ناک کا قصور ہے۔“

”یہ لوہے کے ٹکڑے یہاں کیوں پڑے ہیں؟“

”نالہ توڑا تھا۔ یہ اس کے ٹکڑے ہیں۔“

”کس کا نالہ توڑا تھا آپ نے؟“

”اپنا“

”کیوں توڑا تھا؟“

”چابی گم ہو گئی تھی۔“

”اس الماری میں کیا ہے؟“

”کتابیں“

انسپکٹر صاحب کتابوں کے ناموں پر نظر دوڑانے لگے۔ معاً انہوں نے

ایک کتاب نکال کر پوچھا۔

”اس کتاب میں کیا لکھا ہے؟“

”پڑھ لیجئے۔“

”میں ذرا انگریزی کم سمجھتا ہوں۔“

”تو پھر رہنے دیجئے۔“

”نہیں آپ یہ چند سطریں جو اس کے گرد پوش پر لکھی ہیں۔ پڑھ کر مجھے سنائیے۔“

”لکھا ہے کہ جس ملک میں آزادی تحریر و تقریر پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں وہ ملک مہذب کہلانے کا حقدار نہیں۔“

”یہ الفاظ قابل اعتراض ہیں۔“

”یہ پنڈت نہرو کے الفاظ ہیں۔“

”پھر ٹھیک ہیں۔“

انسپیکٹر صاحب نے چارپائی پر بڑی ہوتی رضائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس رضائی میں کیا ہے؟“

”دھنی ہوئی روٹی۔“

”میرا مطلب ہے روٹی کے علاوہ۔“

”ہوا۔“

”میں کپڑے کو اُدھیڑ کر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”فائدہ؟“

”شاید کوئی قابل اعتراض چیز نکل آئے۔“

جب رضائی کا کپڑا اُدھیڑا گیا۔ روٹی کے اوپر ایک مرا ہوا کپڑا

پایا گیا۔

”ان ٹرنکوں میں کیا ہے؟“

”بم آور پستول۔“

”مذاق مت کیجئے۔ ٹھیک ٹھیک بتائیے۔“

”اینٹیں اور پتھر“

”آپ پھر مذاق کر رہے ہیں۔ صاف صاف کہیے۔“

”آپ کے خیال میں کیا ہو سکتا ہے؟“

”کپڑے“

”پھر پوچھ کس لئے رہے ہیں؟“

”یہ میرا فرض ہے۔“

تمام ٹرنک کھلوائے گئے۔ ہر ایک کپڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھا گیا۔ ٹین کو ہٹو کے دے کر تسلی کی گئی کہ یہ واقعی ٹین ہی ہے۔

”اس مرتبان میں کیا ہے؟“

”سانپ اور بچھو“

”اس بکس میں کیا ہے؟“

”لڑے اور بھلیاں۔“

”اس ریڈیو میں کیا ہے؟“

”آہیں اور کراہیں۔“

اس طرح تلاشی کا سلسلہ تین گھنٹے جاری رہا۔ ان تمام چیزوں کی فہرست بنائی گئی۔ جو کیمیکل اگر افسیر اور اسلحہ جات کے ماہرین کے پاس بھیجی جائے گی۔ فہرست میں یہ چیزیں خاص طور پر قابل ذکر تھیں۔ منی کے تیل کا کنسترو۔ لوہے کے ٹکڑے۔ تمباکو اور فونیٹین پین۔ فہرست

تیار کرنے کے بعد انسپکٹر صاحب نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
 ”میں تمہیں زیر دفعہ ۷۷ پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کرتا ہوں۔“
 چھ مہینے جیل میں نظر بند رہنے کے بعد جب وہ رہا ہوا۔ تو اسے
 چتہ چلا کہ اس کی گرفتاری اس لئے عمل میں لائی گئی تھی کہ وہ ایک
 ایسی دکان کے سامنے سے گذرتا ہوا دیکھا گیا تھا۔ جہاں لال کتابیں
 فروخت کی جاتی ہیں۔

جانشین

(پہلا منظر)

(سورگ دھام میں ”باپو“ ایک کنج میں سنگ مرمر کی چوکی پر بیٹھے چرخہ چلا رہے ہیں۔ اُن کا چہرہ اُداس اور سنجیدہ ہے۔ بائیں طرف سے نار دھمنی اُتارے کو بجاتے ہوئے ”نارائن“ ”نارائن“

کی صدا لگاتے ہوئے باپو کے قریب آتے ہیں)

نار دھمنی۔ نارائن! نارائن!! جب دیکھو چرخہ چلا رہے ہیں۔ جیسے سورگ میں کپڑے کاٹوڑا ہے۔ ہما تاجی! یہ سورگ پوری ہے۔ بھارت دیش نہیں۔ کیا کیجئے گا اتنا سوت کات کر؟

باپو۔ بھئی یہ تو شیدھی شی بات ہے۔ شوت کات کر بھگت کبیر کو دوں گا۔ وہ میرے لئے شیدھ کھدر تیار کر دیں گے۔ اُسے پہنوں گا۔

نارو منی (تقہ لگا کر) شدہ کھدر کی بھی خوب کہی! اچی جب پہننے کو
 ریشم ملتا ہے۔ تو کھدر تیار کرنے کا فائدہ؟ کہاں ریشم کہاں کھدر!
 باپو۔ ایشامت کہیئے ناروجی۔ کھدر کا اپمان مت کیجئے۔ کھدر مجھے جان
 شے بھی پیارا ہے۔

نارو منی۔ مہا تاجی۔ ایک دفعہ ریشم پہنئے۔ کھدر کو بھول جائیے گا۔
 باپو۔ یہ تو آپ کہتے ہیں نا۔ مگر میں تو کہتا ہوں۔ ایک بار کھدر پہنئے۔
 آپ ریشم پہننا چھوڑ دیجئے۔

نارو منی۔ نارائن! نارائن! کیسی عجیب بات کرتے ہیں آپ؟
 باپو۔ بھئی، میری شب بامیں عجیب ہی ہوتی ہیں۔
 نارو منی (ایک لمحہ کے لئے چپ رہنے کے بعد) یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔
 اب اسی کو لیجئے۔ جب سے آپ سورگ میں آئے ہیں۔ اُداس
 سے رہتے ہیں۔ سورگ دھام اور اُداسی! عجیب سی بات ہے۔
 باپو۔ بھئی! تم میرے من کا حال کیا جانو؟ میں ہی جانتا ہوں۔ جودل پر
 گذرئی ہے۔

نارو منی۔ آخر وہ کونسی بات ہے۔ جس نے آپ کو پریشان کر رکھا ہے؟
 بھارت آزاد ہو گیا۔ جتنا خوش حال ہے۔ دھن۔ منج۔ کپڑا کسی چیز
 کی کمی نہیں۔ آپ کے جانشین آپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔
 باپو۔ (سرد آہ بھر کر) کاش ایشا ہی ہوتا!
 نارو منی۔ تو گویا آپ کو شک ہے کہ ایسا نہیں ہے۔

باپو۔ شک ہی نہیں۔ پورا دشا اس ہے۔
 نار دمنی۔ گستاخی معاف! میں یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔
 باپو۔ آپ پہلے بھارت ورث کی دشا (حالت) اپنی آنکھوں سے دیکھ
 آئیے۔ پھر بحث کیجئے گا۔

نار دمنی۔ بہت اچھا! میں ابھی جاتا ہوں۔
 باپو۔ جانیے۔ لیکن اس بات کا خیال رکھیے گا کہ کوئی آپ کو پہچان نہ
 لے۔

نار دمنی۔ اس کی فکر مت کیجئے۔ بھیس بدلنے میں مجھے کمال حاصل ہے۔

(دوسرا منظر)

ایک سیٹھ باپو کی تصویر پر پھول چڑھانے کے بعد "رام دھن"
 گارہا ہے۔ جس وقت وہ بھجن کی آخری سطر پڑھتا ہے۔ نارو
 منی ایک شرنارتھی کے بھیس میں اس کے پاس آتے ہیں۔

نار دمنی۔ نئے سیٹھ جی!

سیٹھ (بے رخی سے) نئے

نار دمنی۔ آپ کی گاندھی جھگتی سے من بہت پرسن ہوا۔ آپ دھنیہ
 ہیں۔

سیٹھ۔ میں تو دھنیہ ہوں ہی۔ لیکن تم کون ہو؟
 نار دمنی۔ ایک غریب شرنارتھی!

۱۰۹	_____	الم علم
۱۱۷	_____	اپنی یاد میں !
۱۲۳	_____	بندہ پرور اکب تلک ؟
۱۳۹	_____	سننی خیز
۱۳۷	_____	چوٹ راجا
۱۳۳	_____	گبار کھاتر
۱۳۷	_____	آزادی کی قسم
۱۵۲	_____	دزیریس
۱۶۳	_____	نیا تشکبج
۱۷۱	_____	خاموش نغمے
۱۷۹	_____	حماقت
۱۹۰	_____	خط کا جواب

سیٹھ - پچھنا شرنارتھی ؟ مجھے شک ہوا تھا۔ کہ انسان ہو۔ یہاں کس لئے
منڈلا رہے ہو ؟

نارومنی - سنا ہے آپ کے ہاں ایک کمرہ خالی ہے۔

سیٹھ - ہاں ہاں ! ہے تو یہی۔ تمہیں ضرورت ہے کیا ؟
نارومنی - جی ہاں۔

سیٹھ - تو پھر لے لو۔

نارومنی - کرایہ کیا ہوگا ؟

سیٹھ - معلوم ہوتا ہے۔ دہلی میں پہلی بار آئے ہو۔ چھوٹے ہی کمرے پوچھا۔
پہلے پگڑی کا فیصلہ تو کرو۔

نارومنی - پگڑی ؟ وہ کیا بلا ہے ؟

سیٹھ - یہ تو تب پتہ چلے گا جب ادا کرو گے۔

نارومنی - اچھا تو پگڑی کا فیصلہ کر لیجئے۔

سیٹھ - دس ہزار ہوگی۔

نارومنی - دس ہزار ! میں غریب شرنارتھی ہوں۔ دس ہزار کہاں سے

لاؤں ؟

سیٹھ - تو مت لاؤ۔ کیا ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ ضرور کمرالو۔ اور وہ بھی

دہلی میں۔ بھارت کی راجدھانی میں۔

نارومنی - کچھ رعایت کیجئے۔

سیٹھ - دس ہزار سے ایک دمٹری کم نہیں لوں گا۔

نار دُستی (عاجزی سے) شمر نارہتیوں پر رحم کیجئے۔
 سیٹھ (قہقہہ لگا کر) رحم اور دلی میں! معلوم ہوتا ہے۔ اس شہر سے
 پالا نہیں پڑا۔

نار دُستی (گڑ گڑا کر) پر ماتا کے لئے!
 سیٹھ۔ پر ماتا کا نام مستلو۔ یہ دلی ہے۔
 نار دُستی۔ باپو کے لئے۔

سیٹھ۔ پھر وہی بات۔ ایک دفعہ جو کہہ دیا۔ یہ دلی ہے۔
 نار دُستی۔ اوہ پر ماتا! اب میں کیا کروں؟
 سیٹھ۔ جہنم میں جاؤ۔ گھر میں نہیں لٹے، پان کھاؤں البتہ۔ جیب میں
 پھونکی کوڑی نہیں اور چلے ہیں مکان لینے دلی میں۔ صبح صبح کس
 کنگال کاٹنہ دیکھنا پڑا۔

نار دُستی۔ مگر سیٹھ جی ہم شہر.....
 سیٹھ۔ میں اگر مگر سنے کے لئے تیار نہیں۔ خواہ مخواہ کان مت کھاؤ چلتے
 پھرتے نظر آؤ۔ نہیں تو ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔

(نار دُستی اوس ہو کر چلے جاتے ہیں)
 سیٹھ۔ (باپ کی تصویر کی طرف دیکھ کر) باپو — آپ پر اتھنا کیا کرتے تھے
 ہ سب کو سستی دے بھگوان
 رام جانے ان شمر نارہتیوں کو کب سستی "آئے گی۔

(تیسرا منظر)

ایک کمرے میں انٹرویو بورڈ امیدواروں سے انٹرویو کر رہا ہے۔ نارومنی ایک امیدوار کے بھیس میں کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔

انٹرویو بورڈ کا ایک ممبر۔ تعلیم؟ قابلیت؟ سفارش؟
نارومنی۔ فرسٹ کلاس ایم اے ہوں۔ یونیورسٹی میں دوئم رہا تھا۔
دوسرا ممبر۔ سفارش؟
نارومنی۔ سفارش کوئی نہیں۔

تیسرا ممبر۔ (تہقہ نگار) سفارش کوئی نہیں اور ملازمت حاصل کرنے آئے ہیں!

پہلا ممبر۔ کسی وزیر کے رشتہ دار ہو؟
نارومنی۔ نہیں۔

دوسرا ممبر۔ کسی سیفیر سے راہ ورسم ہے؟
نارومنی۔ نہیں۔

تیسرا ممبر۔ کسی ایم۔ ایل اے کے داماد ہو؟
نارومنی۔ نہیں۔

پہلا ممبر۔ نوجوان! تم نے درخواست دے کر خواہ مخواہ اپنا اور ہمارا وقت ضائع کیا۔ تم جا سکتے ہو۔ تمہیں حشر تک کوئی ملازمت نہیں ملے گی۔

بہو تھا منظر

عدالت کا کمرہ - ایک ملزم کٹھڑے میں کھڑا ہوا ہے۔ ناروینی
ایک تماشائی کی حیثیت سے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔
ملزم (جج سے) جناب میں بالکل بے قصور ہوں مجھے خواہ مخواہ گرفتار کیا
گیا ہے۔

جج - (سرکاری وکیل سے) سرکاری وکیل وجہ بیان کرے کہ ملزم کو کیوں
گرفتار کیا گیا ہے؟
سرکاری وکیل - جناب - ملزم سے واقعی فی الحال کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔
جج - تو پھر گرفتاری کا مطلب؟
سرکاری وکیل - اُسے شک کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے۔

جج - تمہارا مطلب؟
سرکاری وکیل - مطلب یہ کہ گو ملزم سے فی الحال کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔
لیکن تمہیں خطرہ ہے کہ مستقبل قریب میں اُس سے کوئی نہ کوئی جرم
ضرور سرزد ہو کے رہے گا۔

جج - (ملزم کو) اگر یہ بات ہے۔ تو آپ کو ہر شخص کو ابھی سے گرفتار کر لینا
چاہیئے۔

سرکاری وکیل - مجھے کوئی عذر نہیں۔ دراصل پبلک سیفٹی ایکٹ کا مقصد
بھی یہی ہے۔

بج - میں ملزم کو بری کرتا ہوں -
سرکاری وکیل - یہ ظلم مت کیجے گا جناب - پہلک سیفٹی ایکٹ کسی کو منہ
دکھانے کے قابل نہ رہے گا -

بج - یہ کوئی دلیل نہیں - (ملزم سے) تم بری کئے جلتے ہو -

ملزم - شکریہ! ایک عرض کر سکتا ہوں جناب !!

بج - ہاں ہاں - کیا کہنا چاہتے ہو؟

ملزم - اذراہ کرم انہیں تنبیہ کر دیجئے - کہ گھر پہنچنے سے پہلے مجھے دوبارہ
گرفتار نہ کرادیں -

(پانچواں منظر)

وزیر خوراک جھوکوں کے مجمع میں گھرا ہوا ہے - نارد ایک جھوکے آدمی

کے بھیس میں مجمع میں شامل ہو جلتے ہیں)

نارد - روٹی! روٹی!!

وزیر خوراک صبر کرو - اور اناج اگاؤ ہم "کے کامیاب ہونے کے بعد تمہیں

روٹی ضرور ملے گی -

نارد - اس وقت کیا کھائیں؟

وزیر خوراک - اس وقت "ہفتے میں سات دن فاقہ کرو ہم" پر عمل کرو -

نارد - ہم جھوکوں میں رہائیں گے -

وزیر خوراک - تمہیں موت سے بچانے کے لئے میں زیادہ سے زیادہ درخت اکاڑا ہوں۔

نارو - کیا درختوں پر روٹیاں اگیں گی؟
وزیر خوراک - روٹیاں نہیں تو پتے تو ضرور اگیں گے۔ تم درختوں کے پتے کھا کر اپنا پیٹ بھر سکتے ہو۔

نارو - کیا ہم حیوان ہیں؟ — آپ خود پتے کیوں نہیں کھاتے؟
وزیر خوراک - کیا میں اس لئے وزیر خوراک بنا ہوں کہ درختوں کے پتے کھاؤں۔
نارو - کیا ہم نے آپ کو اس لئے وزیر خوراک بنایا ہے کہ آپ ہمیں درختوں کے پتے کھلائیں؟

وزیر خوراک - تم بہت گستاخ ہو۔

نارو - آپ بڑے ستم ظریف ہیں۔

وزیر خوراک - بھاگ جاؤ تمہیں کھانے کو پتے بھی نہیں ملیں گے۔

(بچھٹا منظر)

سورگ دھام میں باپو حسب معمول چرخہ چلا رہے ہیں۔ نارو دُمنی بھارت کی یا ترائے سے واپس آکر انہیں ملتے ہیں)
نارو دُمنی - نارائن! نارائن! بھارت کی دُشا دیکھ کر تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔
باپو - اب کہیئے نارو دُجی! میں ٹھیک کہتا تھا یا آپ؟

نار دمنی۔ آپ کے جانشینوں نے تو کمال کر دیا۔

باپو۔ نار دجی! انہیں میرے جانشین کہہ کر میرا پیمانہ مت کیجئے۔

نار دمنی۔ مجھے امید نہ تھی کہ آپ کے بھگت اتنے بکھے ثابت ہونگے۔

باپو۔ ایشی تو مجھے خود کبھی آشا نہ تھی۔ لیکن پھشوش انہوں نے تو دیش

کی گٹیا ہی ڈبلو دی۔ کاش کوئی انہیں سمجھا دے۔ کہ باپو کی آتما کتنی

دکھی ہے۔ کتنی دکھی ہے۔ کتنی دکھی ہے۔

(باپو کی آواز بھرا جاتی ہے۔ ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ

آنسو گر رہے ہیں۔ نار د بالکل خاموش اور مہرمت ہیں)

کھجور کا درخت

”چانگ پو“ جب جزیرہ ”ٹنک“ سے بھاگا۔ تو اس نے جزیرہ ”چنک“ میں پناہ لی۔ چنک سے بھاگ کر وہ جزیرہ ”ٹنک“ میں پہنچا۔ لیکن جب اسے یہاں سے بھی بھاگتے بنی تو اس نے جزیرہ ”ٹنک“ کا رخ کیا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کا ستارا گردش میں تھا۔ یعنی اس کے پاؤں میں چکر تھا۔ اس لئے اسے وہاں سے بھی بھاگنا پڑا۔ اس بار وہ اس دور سے بھاگا کہ اس نے آری کیا“ کے جنگل میں جا کر دم لیا۔ یہاں پہنچ کر اسے بہت تسلی ہوئی۔ کہ اب کوئی شخص اُسے بھاگنے پر مجبور نہیں کرے گا۔ اس نے ایک کھجور کے درخت کے تلے بسیرا کیا۔ چشمے کے ٹھنڈے پانی میں اپنے دھول سے اٹھے ہوئے پاؤں دھوئے۔ اور خدا کا شکر بجالایا۔ کہ جس نے اس کی جان بچائی تھی۔

اپنے ملک سے وہ صرف تین چیزیں اپنے ہمراہ لایا تھا۔ اور وہ تھیں

کنفیوشس (CONFUCIUS) کی کتاب چائے کے بہت سے ڈبے اور
 وائرلیس (WIRELESS) پیغام بھیجنے کا آلہ۔ اس نے ان تینوں چیزوں کو
 غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ آدمی کیوں خواہ مخواہ سیاست
 کے بکھڑے میں پڑے؟ کیا یہ کافی نہیں کہ وہ چائے پیئے۔ کنفیوشس کا
 مطالعہ کرے۔ اور کبھی کبھی دنیا والوں کو وائرلیس کے ذریعے اپنا پیغام بھیجے؟
 جب وہ یہ سوچ رہا تھا اس کی نظر ایک جنگلی پودے پر پڑی۔ جس پر
 بڑے بڑے سرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔ سرخ پھول، وہ مارے خوف کے
 کانپ اٹھا۔ لمحہ بھر کے لئے وہ گم سم کھڑا رہا۔ اس کے بعد اس نے بہت
 سے کام لے کر سرخ پھولوں کو توڑ توڑ کر پاؤں تلے مسلنا شروع کیا۔ آخری
 پھول کو مسلتے ہوئے ایک کانٹا دور سے اس کے پاؤں میں چھپا اور اس
 نے رونی آواز میں کہا۔ ”کم بخت یہاں بھی چھپا نہیں چھوڑتے۔“
 جنگل میں چانگ چو کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔ اس بات سے
 اسے سرت ہوتی تھی۔

”کیا ہوا“ وہ اکثر اپنے آپ سے کہتا۔ ”اگر میں اپنے ملک کا راجہ نہیں رہا۔
 میں اب جنگل کا راجہ ہوں۔ میں نے اپنا ملک کھو کر ایک نیا ملک پایا ہے۔“
 جنگل میں چانگ چو کو کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ صبح و شام وہ چائے
 پیتا، دوپہر کو وہ کنفیوشس کی کتاب پڑھتا اور رات کو وائرلیس کے ذریعے
 پیغامات بھیجتا۔ ”ہم جنگل سے بول رہے ہیں۔ سچ ہمارے دارالخلافے
 میں کوئی حادثہ ایسا نہیں ہوا۔ جس میں اخبار والوں کو دھپسی ہو۔ اس

لے گڈ نائٹ“

چانگ چو کو جنگل میں رہتے ہوئے دو برس ہو گئے۔ اس عرصہ میں اس کا ذہن تین سیر بڑھ گیا۔ اس کا سبب شاید یہ تھا کہ اسے کسی بات کا غم نہیں تھا۔ علاوہ ازیں اسے سرور دکھانے کو تازہ کھجوریں مل جاتی تھیں۔ ایک رات اس نے بھر پیٹ کھجوریں کھائیں۔ آفد موج میں آکر دنیا بھر کے راجاؤں کے نام یہ اعلان کیا: ”اگر بد قسمتی سے کوئی راجہ مصیبت میں پھنس گیا ہو۔ تو وہ ہرگز نہ گھبراے۔ سیدھا ہمارے پاس چلا آئے۔ ہم اسے ایسی تدبیر بتائیں گے کہ اس کی تمام تکالیف دودھ ہو جائیں گی۔“

یہ پیغام ٹول تو تمام راجاؤں نے سنا۔ مگر اسے چل دیش کے راجہ نے خاص طور سے بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا۔ بات یہ تھی کہ مہاراج چیل کو ایک عجیب بات نے بہت دنوں سے پریشان کر رکھا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ صبح سویرے وہ جنگل کو چل دیں گے۔ دوسرے دن راجہ صاحب ایک پرانے رتھ میں سوار ہو کر جس کے آگے چوہ مرل گھوڑے جتے ہوئے تھے جنگل کو روانہ ہوئے۔

سفر بہت لمبا تھا اور مرل گھوڑے بہت آہستہ آہستہ چلتے تھے۔ لیکن مہاراج چیل نے ہمت نہ ہاری اور دن رات برابر چلتے ہوئے وہ تین ماہ کے بعد اس جنگل میں پہنچے میں کامیاب ہو گئے۔

چانگ چو اس وقت چائے پی رہا تھا۔ مہاراج چیل نے آداب

پیش لفظ

ایک روسی ادیب کا مقولہ ہے کہ مذاق اڑانا مذاق نہیں! ایک انگریز مصنف کہتا ہے مزاحیہ نگاری سے آسان تر شاید ہی کوئی صنف ہوگی۔ خدا جانے ان دونوں میں سے کون سچا ہے۔ اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ اگر طبیعت موزوں ہو اور احتیاطی نظر بند نہ ہو۔ تو مذاق اڑانا اتنا ہی آسان یا دشوار ہے جتنا شعر کہنا۔ تقریر کرنا یا قوالی پر سر دھننا۔

مذاق اڑانے کے متعلق سب سے بڑا مذاق یہ ہے کہ جب کبھی مزاحیہ نگار کا نشانہ چوک جاتا ہے وہ بچا رہ خود مذاق کا نشانہ بن جاتا ہے۔ شاید اسی لئے یسوع مسیح نے انجیل مقدس میں فرمایا تھا۔ کسی پر تنقید مت کرو۔ تاکہ کوئی تم پر تنقید نہ کرے! مزاح اور خاص کر طنز بہت حد تک ایک قسم کی سنگتہ تنقید ہے۔ میری دانست میں اچھی طنز لکھنے کے لئے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

بجالاتے ہوئے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا۔ ”میں چیل ویش کا راجہ ہوں۔ کچھ ماہ سے میرا سنگھاسن اس طرح ڈول رہا ہے۔ جیسے بھونچال آ رہا ہو۔ میں آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ میری مدد فرمائیں!“

چانگ چو نے مہاراجہ چیل کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور چائے پیش کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اچھا تو آپ کے سنگھاسن کو یہ مرض ہوا کیسے؟“
 ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ مہاراجہ چیل نے جواب دیا۔
 ”آپ نے اسے قائم رکھنے کے لئے کیا تدبیر کی ہے؟“
 ”ہزاروں تدابیر کیں۔ مگر کوئی کارگر نہیں ہوئی۔“
 ”ہوں“ چانگ چو نے یک لخت سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔
 ”عجیب بات ہے۔“

”عجیب تو ہے ہی“

چند لمحوں کے سکوت کے بعد وہ پھر بولا۔ ”اگر آپ بُرا نہ مایوس تو ہیں آپ سے چند اور سذالات دریافت کروں۔“
 مہاراجہ چیل نے جلدی سے کہا۔ ”اُمں اُمں بڑی خوشی سے پوچھیے۔“
 ”کیا آپ کے وزیر سمجھ بوجھ کے مالک ہیں؟“

”اے چانگ چو مہاراج!“ مہاراجہ چیل نے حیرت سے کہا۔ ”یہ آپ نے کیا سوال کیا ہے؟“ کیا آپ واقعی سمجھتے ہیں کہ راجہ پاٹ کا کام چلانے کے لئے سمجھ بوجھ کی بھی ضرورت ہوتی ہے؟ میرا تو خیال یہ ہے کہ.....“

”میں آپ کا مطلب سمجھ گیا“ چانگ چو نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔
 ”اب یہ بتائیے کہ آپ کے وزیر زمانے کے رُخ کے ساتھ چلتے ہیں یا
 اس کے مخالف؟“

”یہ اور بھی عجیب سوال ہے۔ میرے وزیروں کو اتنی فرصت ہی
 کہاں ہے کہ وہ زمانے کے رُخ کو معلوم کر سکیں؟“

”جب یہ بات ہو“ چانگ چو نے پھر بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تو
 اس کے ساتھ چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔ اچھا تو
 یہ فرمائیے۔ کیا آپ کے ملک میں بولنے۔ لکھنے اور سوچنے کی آزادی ہے؟“
 ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”مطلب یہ کہ اگر آپ آنکھ سے کانے ہوں اور کوئی شخص آپ سے
 کہے کہ آپ کانے ہیں۔ تو آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟“
 ”ہم اس گستاخ کی دونوں آنکھیں پھوڑ ڈالتے ہیں۔“

”خوب! چانگ چو نے مسکرا کر کہا۔ ”میں بھی کبھی ایسا ہی کیا کرتا تھا۔
 اچھا اب یہ بتائیے کہ آپ کو کس چیز سے زیادہ خطرہ محسوس ہوتا ہے؟“
 ”بہت سی چیزوں سے۔ مثال کے طور پر افق کی سُرخی سے۔ بھرپور
 ہوتی آگ سے۔ آگ میں تپے ہوئے لوہے سے۔“

”آپ کا سگھاسن کس وقت ڈولتا ہے؟“
 ”یوں تو ہر وقت ہی ڈولتا رہتا ہے۔ لیکن خاص طور سے اس وقت
 جب میرے کانوں میں خوفناک آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔“

”وہ آوازیں کون سی ہیں؟“
 ”میں انہیں بیان نہیں کر سکتا۔ کبھی یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے
 ہزاروں بچے مل کر رورہے ہوں۔ کبھی جیسے لاکھوں عورتیں آہ و زاری کر
 رہی ہوں۔ اور کبھی ایسے جیسے بہت خوفناک طوفان اٹھ رہا ہو۔“
 ”ہوں۔“ چانگ چو نے اپنی گنجی چندیا کو کھلاتے ہوئے کہا۔ ”اب
 آخری سوال! کیا پاتال دیش کے راجہ سے تو آپ کی دوستی نہیں؟“
 ”ہے تو ہی“

”کیا اس کا ارادہ آپ کو مدد دینے کا تو نہیں؟“
 ”وعدہ تو کیا ہے لیکن ابھی تک مدد کی نہیں۔“
 ”کیا آپ کو امید ہے کہ آنے والے سالوں میں وہ آپ کی مدد کریگا؟“
 ”ہاں“

پورا یقین ہے؟“
 ”سو فی صدی“

”ہا۔۔۔۔۔ سو فی صدی! ہا! ہا! سو فی صدی۔ ہا! ہا! اور چانگٹ
 قہقہے لگا کر ہنسنے لگا۔ اور ویرنگ ہنسا رہا۔ جیسے وہ ایک دم پاگل ہو
 گیا ہو۔“

مہاراجہ چیل اسے یوں ہنستے دیکھ کر ششدر سے رہ گئے۔
 ”بات کیا ہے؟“ انہوں نے قدرے غصہ سے پوچھا۔ ”تم اس زور
 سے کیوں ہنس رہے ہو؟“

”بات بہت سیدھی سی ہے۔“ چانگ چو نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔
 ”بات صرف اتنی ہے میرے پیارے مہاراجہ چیل ! کہ ایک دن آپ کو
 بھی میری طرح اس گھوڑے کے درخت کے نیچے بسیرا کرنا پڑیگا۔
 اور میرا تو مشورہ ہے کہ آپ اپنے ملک کو واپس جانے کا ارادہ ترک کر
 دیں۔ اور یہیں میرے ساتھ آرام فرمائیں۔ کہ کنفیوشس نے کہا ہے:-
 چانگ جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
 خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے یوانے دو
 یہ سن کر مہاراجہ چیل چانگ چو کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ لیکن چانگ چو
 نے ہنس کر کہا۔
 ”کہیئے کیا ارادہ ہے؟ یہیں رہیئے گا یا آپ کے لئے کوئی دوسرا گھوڑا
 کا درخت تلاش کیا جائے؟“

نوٹ کر لیجئے

”اگر میں اب سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو گیا ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھ پر فواج گرا ہے۔ میں نے کوئی فیکٹری الاٹ کرا لی ہے۔ یا میری زبان تنگ ہو گئی ہے جی نہیں بات یہ ہے کہ پہلے کی بہ نسبت میں بہت محتاط اور سمجھ دار ہو گیا ہوں۔ آج سے چند سال پہلے مجھے سیاست سے بڑا شغف تھا۔ کلب میں اور کلب سے باہر گھنٹوں سیاسی موضوعات پر تبصرہ کرنا میری سب سے بڑی تفریح تھی۔ ادھر کسی نے ملاک یا دنیا کے حالات کا ذکر چھیڑا۔ اور میں جھٹ دخل در سیاست ہو گیا۔ اسی رہنے دیجئے کیا سمجھیں گے سیاست کو۔ دماغ چاہتے ہیں الاوامی مسائل کو سمجھنے کے لئے۔ آپ بس روزانہ بارغ جایا کیجئے۔ جو آپ کا کام ہے۔“

کسی نے یوں ہی کہہ دیا۔ ”اب تو روس اور جرمنی میں جنگ ہو کر رہی۔“

تو میں نے فوراً چلا کر کہا ”آپ سے کس بھڑوے نے کہا۔ کہ جنگ ضرور ہوگی۔ نوٹ کر لیجئے۔ جنگ نہیں ہوگی۔“ اور پھر جو میں نے بین الاقوامی صورت حال سے بحث کرنا شروع کی۔ تو سامعین دم بخود رہ گئے۔ بات بات میں تاریخی دستاویزوں اور حقائق کے ایسے ایسے حوالے پیش کئے کہ سننے والوں نے ہی سمجھا کوئی ملک مجھ سے مشورہ کئے بغیر جنگ کر ہی نہیں سکتا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ایک مخصوص حلقے میں مجھے بین الاقوامی مفکر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اور بعض اشخاص تو مجھے اچھا خاصہ سیاسی پیغمبر سمجھنے لگے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں لوگ اکثر میرے پاس آتے اور طرح طرح کے سوال کر کے اپنے سیاسی شکوک رفع کیا کرتے ”کہئے اب کیا خیال ہے؟“ کسی نے جنرل رومیل کی افریقہ میں برقی رفتار پیش قدمی سے گھبرا کر پوچھا اور میں نے چہرے پر متانت اور سنجیدگی کے جملہ آثار پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔ نوٹ کر لیجئے۔ افریقہ میں ہٹلر کی فتح یقینی ہے میں نے بین الاقوامی حالات کا جہاں تک مطالعہ کیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔“ ”اور اس کے بعد؟“ سوال کرنے والے نے ہڑبڑا کر کہا۔ ”اس کے بعد ظاہر ہے کہ ہٹلر مندوستان پر حملہ کریگا۔ اور دس بارہ گھنٹوں میں اس کا صفایا کر دے گا۔“

”جی پڑھا آپ نے؟ جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا۔ اب کیا ہوگا؟“
 ”روس ہار جائے گا۔ ہفتے کے اندر اندر۔ نوٹ کر لیجئے۔“

”امریکہ جنگ میں کود پڑا ہے۔ اب بتائیے اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟“
 ”اونٹ کسی کروٹ بیٹھے پر نوٹ کر لیجئے۔ امریکہ کو شکست فاش ہوگی۔“
 ”روس، امریکہ اور انگلینڈ میں فوجی معاہدہ ہو گیا ہے۔ اس کا جنگ پر کیا اثر ہوگا؟“

”جنگ کی رفتار تیز ہونے کے بجائے سست ہو جائے گی۔“
 ہر روز میں اس قسم کی سنسنی خیز پیش گوئیاں کرتا اور سننے والوں کے چہروں سے رنگ اڑ جاتا۔ ڈر اور گھبراہٹ کے مارے ان کے اوسان خطا ہو جاتے۔ انہیں اپنی جائیدادوں کو فروخت کرنے۔ بیوی بچوں کو محفوظ مقامات پر پہنچانے اور کمپنیوں کے حصص کو اونے پونے داموں بیچنے کا خیال تلنے لگا۔ لیکن میری اکثر پیش گوئیاں غلط ثابت ہوتیں۔ وہ دوڑے دوڑے میرے پاس آتے اور کہتے:-

”آپ نے تو کہا تھا کہ روس ایک ہفتے کے عرصے میں مار جائے گا۔ لیکن وہ ابھی تک بدستور لڑ رہا ہے!“

میرے پاس ان سوالوں کے معقول جواب پہلے ہی سے تیار رہتے۔
 ”ٹھیک ہے۔ لیکن میں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ جنگ کی رفتار تیز ہونے کے بجائے سست ہو جائے گی۔ نوٹ کر لیجئے۔ شکست انجام کار روس ہی کو ہوگی۔“

”لیکن روس تو بہت طاقت ور ہے جناب!“
 ”قبلہ ابھی جرمنی نے بڑا حملہ شروع ہی کیا ہے۔ ابھی تو وہ روس

”یہ مت پوچھئے یہ صرف میں ہی جانتا ہوں اور بہت ممکن ہے مسلم لیگ کو بھی اس کا علم ہو۔“

لیکن کانگریس، نیشنلسٹ مسلمانوں اور ہندو مہاسبھائیوں کی مشترکہ کوششوں اور مخالفتوں کے باوجود پاکستان قائم ہو گیا اور میں اپنے معتقدوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ چنانچہ میں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ پاکستان سے بھاگ کر ہندوستان چلا جاؤں۔

ہندوستان پہنچ کر میں نے سوچا کہ سیاسیات سے بالکل کنارہ کشی کروں کہ یہ میرے بس کا رنگ نہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ بندہ خدا! جب تم سیاسیات کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہو۔ اس کی شطرنج کے مہروں کو پہچان نہیں سکتے اور ہتھاری سیاسی واقفیت ایک آدھ انگریزی روزنامے کے مطالعے تک کہ جو تم ہمسائے سے مانگ کر پڑھتے ہو۔ محدود ہے خواہ مخواہ سیاست میں دخل دے کر اپنی عاقبت جو کہ سیاست سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ کیوں خراب کرتے ہو۔“ چنانچہ ۱۵ اگست سن انیس سو سینتالیس سے میں تائب ہو گیا۔ ————— نوٹ کر لیجئے۔

اب اگر کسی مجلس میں سیاسی ذکر چھیڑا جاتا ہے تو میں ایک کونے میں بیٹھا چپ چاپ سگریٹ کے کش لگاتا رہتا ہوں۔ اگر کوئی شخص میری رائے طلب کرتا ہے۔ تو میں جواب میں کہتا ہوں ”پہلے آپ بتائیے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“ وہ لمبی چوڑی تقریر کرنے لگتا ہے۔ اور میں اس کی تقریر کے خاتمہ پر کہتا ہوں۔ ”جی ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں آپ سے سو فی صدی متفق

ہوں۔ اگر کسی نے ڈھٹائی سے کام لیتے ہوئے میری لائے دریافت کرنے پر اصرار کیا۔ تو میں جان بوجھ کر بہرا بن جاتا ہوں۔

”آپ کا سٹرلنگ بلینس کے متعلق کیا خیال ہے؟“

”کیا کہا آپ نے؟ میں ذرا اوسچا سنتا ہوں۔“

”سٹرلنگ بلینس“

”اچھا سپرنگ بلینس۔ بڑی اچھی چیز ہے۔ کم از کم ان عام تر از دوں سے تو بہت اچھی ہے۔“

”سٹرلنگ! سٹرلنگ!“

”معاون کیجئے اب سمجھا۔ تیمور لنگ۔ جی ہاں۔ اس کی شجاعت کا تو ہر

شخص قائل تھا۔“

عموماً یہ حربہ کامیاب رہتا ہے۔ لیکن اسے اپنے واقف کاروں کی محفل میں استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں میں لفظ ”اگر“ یا ”بشرطیکہ“ کی پسند لیتا ہوں۔

”سنا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں جنگ ہونے والی ہے۔“

”دیکھئے صاحب اگر ہندوستان اور پاکستان کا ارادہ جنگ کرنے کا

ہے تو ضرور ہوگی۔ اور اگر نہیں ہے تو بالکل نہیں ہوگی۔“

”آثار کیا کہتے ہیں؟“

آثار قدیمہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دونوں ممالک امن سے

رہیں گے بشرطیکہ آثار جدیدہ نازک صورت اختیار نہ کر جائیں۔“

اچھا ہاضمہ تیز و طرار طبیعت - دماغی توازن - اگر ان تینوں میں سے ایک چیز کی بھی کمی واقع ہو جائے - تو طنز طنز نہیں رہتی - دشنام یا ہجو بن جاتی ہے -
راشن اور پراسپیکٹ کے دور میں ہاضمے اور دماغی توازن کے ٹھیک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - رہی تیز و طرار طبیعت تو اس کے متعلق عرض ہے
ہے اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے !

واضح رہے کہ اس مصرعہ میں آفتاب بمعنی ”لاہور“ استعمال ہوا ہے -
لاہور سے ہجرت کرنے کے بعد جب موگا میں سے مسجد ہومدرسہ ہوا خانقاہ ہو
کے مصداق سکونت اختیار کی - تو شوخی تحریر کی فاتحہ پڑھنے کے لئے ہمتاؤ
ذوق کا یہ شعر آڑ لے آیا ہے

تو ہی جب پہلو سے اپنے دل لے رہا جاتا رہا

دل کا پھر کتنا تھا کیا - جاتا رہا جاتا رہا

دوبارہ واضح رہے کہ اس شعر میں ”دل لے رہا“ سے مراد ”بت کم سن“
نہیں بلکہ لاہور ہے -

یہ چند سطور محض اس لئے لکھی جا رہی ہیں کہ اگر ان مضامین کو پڑھ
کر آپ کو مہنسی کی بجائے رونا آجائے - تو آپ کھل کر رونے کے بعد مجھ پر
نہیں بلکہ میرے ماحول پر مہنسیں -

کتہیا لال پور

ڈی ایم کالج — موگا

۲۶ جون ۱۹۵۳ء

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ کہ میں دو مخالف سیاسی جماعتوں کے نمائندوں میں گھر جاتا ہوں۔ اور یہ نہایت نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ دودھ کے جلے کو چھاپھ پھونک پھونک کر پینا پڑتا ہے۔ مبادا منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے کہ مجھے یا میرے دوستوں کو پریشان ہونا پڑے۔

”کیونسلٹ پارٹی سراسر راستی پر ہے۔ سوشلسٹ غلط راہ پر گامزن ہیں۔“

”جی ہاں! اس بات کو تو اب تمام کمیونسٹوں نے تسلیم کر لیا ہے۔“

”سوشلسٹ پارٹی صحیح معنوں میں ملک کی راہنمائی کر سکتی ہے کیونسلٹ عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔“

”جی ہاں۔ اور عوام میں معتد بہ تعداد سوشلسٹوں ہی کی ہے۔“

”آپ کو کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو جانا چاہیے۔“

”کاش میں شامل ہو سکتا۔“

”نہیں آپ کو سوشلسٹ پارٹی کا رکن ہونا چاہیے۔“

”آپ خواہ مخواہ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“

ان موقعوں پر حافظ کا مشہور سیاسی قول ”باکمیونسٹ استالین استالین“

باسوشلسٹ جے پرکاش جے پرکاش؟“ خوب کام آتا ہے کبھی کبھی یوں بھی

ہوتا ہے کہ میرے دوست مضمون ریز بحث کو یوں ابھاد دیتے ہیں کہ یہ پتا

چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تائید کر رہے ہیں یا تردید۔

اس وقت بیچ بچاؤ کرتے ہوئے یوں کہتا ہوں ”آپ دونوں درست فرماتے

ہیں۔ کیونکہ اگر آپ نوٹ کریں۔ تو یہ چیز یوں بھی ہے۔ اور یوں بھی ہے۔
 ”جرمنی پھر اٹھے گا۔ اور ساری دنیا پر چھا جائیگا۔“
 ”روس نے ایسا اٹیم بم تیار کر لیا ہے جو سارے امریکا کو سرسبز بنا دیگا۔“
 ”مٹلر زندہ ہے۔“

”سو بھاش چند ربوس بھی زندہ ہے۔“
 ”دونوں مل کر پاکستان اور ہندوستان پر حملہ کریں گے۔“
 کبھی کبھی ایسی چٹپٹی باتیں کو فی ماؤس میں سنتا ہوں تو بے اختیار منہ
 سے نکل جاتا ہے۔ ”جی نہیں۔۔۔۔۔ آپ نوٹ کر لیجئے۔“
 لیکن فوراً ہی عاقبت کا خیال آتا ہے۔ جو ہر حال سیاست سے کہیں زیادہ
 اہم ہے۔ اور سینے پر کوئی کسے پیلے رکھ کر خاموش ہو جاتا ہوں :-

رمضان یعنی ماہِ آدین یعنی جمنا

رمضان سری نگر سے امرت سر میں واپس آ گیا ہے۔ امرت سر کے ہندوؤں اور سکھوں نے اس کا پر تپاک استقبال کیا۔ ایک خاص جلسے میں اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ پھولوں کے مار پہنائے گئے۔ اور یقین دلایا گیا۔ کہ مسلمان ہونے کے باوجود وہ مشرقی پنجاب میں حفاظت سے رہ سکتا ہے۔ رمضان بہت خوش ہے اور سیٹھ دھن راج جس نے اُسے لکڑی چیرنے پر ملازم رکھ لیا ہے۔ رمضان سے بھی زیادہ خوش ہے۔ دراصل رمضان کے امرت سر سے چلے جانے کے بعد دھن راج بہت پریشان تھا۔ ہندو مزدور تین روپے روزانہ سے کم پر کام کرنے کو آمادہ نہ ہوتے۔ اور اس پر بھی سو سو سونے کرتے کام چور ایسے کہ دن بھر میں مشکل تین من لکڑی چیرتے۔ ان کے برعکس رمضان نہایت شریف مزدور ہے۔ منوں

لکڑی چیرتا ہے۔ لیکن آفت تک نہیں کرتا۔ شام کو جب دھن راج اس کی ہتھیلی پر بارہ آنے کی رقم رکھتا ہے۔ تو جھک کر آداب بجا لاتا ہے اور مسکرا کر کہتا ہے ”صاب تو ہمارا بڑی کھیال رکھتی“ رمضان رات کو زمین پر سوتا ہے۔ لکڑی کے ذخیرہ کے پاس اور اکثر خواب میں اپنی بیوی ریشماں سے بغلیں ہو کر کہتا ہے۔ ”یہ دیکھ میں مشرقی پنجاب سے تیرے لئے پتیل کی چوڑیاں اور مارے آیا ہوں“ اس کی بیوی رنجیدہ خاطر ہو کر کہتی ہے۔ ”یہ میرے کس کام اب تو میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔“

رمضان اسے تسلی دیتے ہوئے سمجھاتا ہے۔ کہ ابھی وہ جوان ہے اور فرط محبت سے اس کے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔ لیکن جب رمضان کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ ریشماں کے بجائے ایک بھاری لکڑی اس کے لمبے لمبے بازوؤں کی گرفت میں ہے۔ رمضان استغفار پڑھ کر لکڑی چیرنے لگتا ہے۔ اس کا مضبوط جسم پسینے میں تر ہوتا جاتا ہے۔ پسینے کے بڑے بڑے قطروں میں کبھی کبھی اسے ننھے عبدال کا بسورتا ہوا چہرہ نظر آتا ہے۔ جو نہایت فریادی لہجے میں کہتا ہے۔ ”ابا سری نگر واپس آ جاو میں بہت اداں ہوں۔“ رمضان پسینے کو ہاتھ سے جھٹک کر ایک دفعہ پھر استغفار پڑھتا ہے۔ اور لکڑی پر زور زور سے کلہاڑے سے برسانے لگتا ہے۔ عموماً اسے تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کی رگیں اور پٹھے لوہے کے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی وہ ہلکی سی تھکن ضرور محسوس کرتا ہے اور اس احساس کو مٹانے کے لئے ہتھوڑ کا مشہور گیت گنگنانے لگتا ہے۔

صبح چھم باغ چھمستانہ دل چھم تازہ یا ون چھم
 بہار س دادھیوں چھم شوقہ سان گلزار چھا ون چھم
 ایسے میں دھن راج اس کے سریلے گلے کی داد دیتے ہوئے کہتا ہے۔
 ”خوب خوب رمضان، تم تو بڑا اچھا گاتے ہو۔“ اور رمضان شرما کر جواب دیتا
 ہے۔ ”صاب اپنے وطن کا گانا گاتی۔“ اور اس طرح لکڑی چیرتے، پلسمینہ
 پونچھے، گیت گنگناتے صبح سے شام ہو جاتی ہے۔ رمضان چیری ہوئی
 لکڑیوں کو اکٹھا کر کے ایک بہت اونچا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ اور دھن راج
 حریصانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔
 ”آج کتنے من لکڑی چیری؟“

”بارے من“

”شباباش! یہ رہے بارہ آنے“
 ”سیٹھ جی! تم ہمارا بڑا کھیال رکھتی۔“
 ”یہ تو میرا فرض ہے رمضان“
 ”سیٹھ جی تیرے پاس آکے ہم وطن بھول گئی۔“
 ”یہاں خوش ہونا؟“
 ”بہت کھش سیٹھ جی! ہم یہاں مزے میں ہے“

اور رمضان واقعی بہت مزے میں ہے۔ وہ ہمیشہ خوش رہتا ہے۔
 صرف ایک دن جب سیٹھ اس پر بگڑا تھا۔ تو اسے ایک لمحے کے لئے
 خیال آیا۔ کہ کھارٹا سیٹھ کی تنہی ہوئی گردن پر فے مارے۔

لیکن دوسرے لمحے وہ یہ سوچ کر اپنے غصہ کو پی گیا۔ کہ اگر سیٹھ مر گیا تو اُسے مزدوری کون دے گا۔

رمضان یعنی ماتا دین لالہ کرم چند کا نوکر ہے۔ وہ پرتاپ گڑھ کا رہنے والا ہے۔ جب وہ اپنے گھر سے چلا تھا۔ اس کی عمر پندرہ سال تھی۔ اب پچیس برس ہے۔ پچھلے چالیس سال سے وہ لالہ کرم چند کی خدمت کر رہا ہے۔ شروع میں اسے صرف روٹی کپڑے پر ملازم رکھا گیا تھا۔ اور وہ بالکل مطمئن تھا۔ پھر جب اسے پانچ روپے ہر مہینے ملنے لگے تو وہ خوشی سے پھولانہ سماتا تھا۔ ماتا دین کی تنخواہ میں ترقی صرف اس وقت کی جاتی ہے۔ جب وہ حق نمک ادا کرتا ہے۔ ایک دفعہ لالہ کرم چند کے ہاں ڈاکہ پڑا۔ تو اس نے اپنی جان پر کھیل کر مالک کی جان بچائی۔ اس سال اس کی تنخواہ میں ایک روپے کا اضافہ کیا گیا۔ پچھلے دنوں فسادات میں ایک غنڈے نے لالہ کرم چند پر وار کیا۔ ماتا دین نے آگے بڑھ کر یہ وار اپنے بازو پر روک لیا۔ اس کا دایاں بازو کٹ گیا۔ اور لالہ کرم چند نے نہایت فیاضی سے اس کی تنخواہ میں دو روپے کا اضافہ کر دیا۔

لیکن ایسے موقعے بہت کم آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ چالیس برس کی جان توڑ خدمت کے باوجود ماتا دین کی تنخواہ بیس روپے سے تجاوز نہیں کر سکی۔ یہ بیس روپے بھی اُسے ہمیشہ نہیں ملتے۔ کبھی کبھی اس سے کوئی قصور سرزد ہو جاتا ہے۔ اور اسے جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے ایک دفعہ

اس سے ایک چائے کا پیالہ ٹوٹ گیا تھا۔ اور اسے پانچ روپے جرمانہ ہوا۔ ایک اور بار اس کی ساری تنخواہ کاٹ لی گئی۔ کیونکہ اس نے رات کے ایک بجے دروازہ دیر سے کھولا تھا۔ ماما دین کی مالکن بہت سخت مزاج ہے۔ وہ اسے ہر وقت ڈانٹتی رہتی ہے۔ اس کی رائے میں وہ نمک حرام کام چور، کمینہ اور سست الموجود ہے۔ وہ اسے آٹے دن برخاست کر دینے کی دھمکیاں دیتی ہے۔ خاص کر جب سے وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ مالکن کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ لیکن لالہ کرم چند ہمیشہ اس سے پورا نہ شفقت سے پیش آتے ہیں۔ جب وہ سارا دن کام کرنے کے بعد تھک کر سست لگتا ہے تو نہایت محبت آمیز لہجے میں اس سے کہتے ہیں۔ ”ماما دین درا ہمارے پاؤں تو داب دیجیو۔ آج ہم کچھ تھک سے گئے ہیں۔“ ماما دین ایک ہاتھ سے پاؤں دابنے لگتا ہے۔ اور لالہ کرم چند اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنا شروع کرتے ہیں۔

”ماما دین! تیری بھی ساری عمر ہمارے ہاں کٹ گئی۔“

”ہاں سرکار!“

”تجھے یہاں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی؟“

”نہیں سرکار“

”میں نے تیرا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔“

”جی ہاں سرکار“

”حالانکہ تیرا ایک بازو کٹ گیا۔ میں نے پھر بھی تجھے برخاست نہیں

”کیا“

”آپ کی مہربانی ہے سرکار۔“

”ماتا دین چالیس برس میں تو نے کتنا روپیہ اکٹھا کر لیا ہوگا؟“

”یہی تین چار سو سرکار۔“

”کافی ہے؟“

”جی سرکار۔ میرے ایسے آدمی کے لئے بہت ہے۔“

رمضان یعنی ماتا دین یعنی جمناکلو کی رہنے والی ہے۔ دہلی میں اسے پیارا لال لایا تھا۔ کلو میں وہ نہایت غلیظ لباس پہنے بھیڑ بگیاں چرایا کرتی تھی۔ پیارا لال سے اس کی ملاقات ایک چٹھے پر ہوئی۔ اس وقت اس کے گال تمازت آفتاب سے تھما رہے تھے۔ آنکھوں میں گلابی ڈورے تھے۔ ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ۔ وہ سیلے کچیلے کپڑوں میں بھی خوبصورت نظر آرہی تھی۔ پیارا لال کو اس پر بے حد ترس آیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ دہلی لے آیا۔ اس دن سے وہ ”بازارِ حسن“ میں مقیم ہے۔ اس کے آنے سے پیارا لال کا کاروبار خوب چل نکلا ہے۔ رئیس زادوں کا نانا لگا رہتا ہے۔ معاملہ چکانے وقت رقم پیارا لال وصول کرتا ہے۔ اور نہایت احتیاط سے اپنے بٹوے میں رکھ لیتا ہے۔ جمناکلو کے حصے میں صرف بخشش آتی ہے۔ جمناکلو آدھی آدھی رات تک جاگتا پڑتا ہے۔ اور کبھی کبھی تو آدھی رات کے بعد بھی سونا نصیب نہیں ہوتا۔ پیارا لال سینما سے لوٹنے وقت دو چار گاہک اپنے ساتھ لے آتا ہے۔

ان کے منہ سے شراب کی بو کے پھپکے نکل رہے ہوتے ہیں۔ اور وہ واہی
 تباہی بکتے ہوئے سیڑھیوں پر بلا روک ٹوک چڑھ آتے ہیں۔ بعض
 اوقات جتنا انہیں بالکل پسند نہیں کرتی۔ لیکن پیارا لال یہ کہہ کر کہ
 ”بہنی ریش ہیں“ اسے راضی کر لیتا ہے۔ اور اگر وہ نہ مانے۔ تو اسے
 چھڑی سے پیٹنے لگتا ہے۔ گاپکوں کے چلے جانے پر جب جتنا تھکن
 سے چور ہو کر پلنگ پر دراز ہوتی ہے۔ تو پیارا لال اس کے قریب لیٹ
 کر اس کا جسم سہلانے لگتا ہے۔ اور نہایت شیریں اور ملائم ہلچے میں
 کہتا ہے۔

”کلو میں تم ذلت کی زندگی بسر کر رہی تھیں؟“
 ”ہاں“

”تمہارے پاس پہننے کو اچھے اچھے کپڑے نہ تھے؟“
 ”یہ درست ہے“

”میں نے تمہیں نقلی سونے کے زیور خرید دئے“
 ”تم بہت اچھے ہو“

”اس کے علاوہ جتنی بخشش ملتی ہے سب تمہاری ہے“
 ”میں بہت جلد امیر ہو جاؤں گی“

”جتنا تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟“

”بالکل نہیں۔ مجھے یہاں بہت آرام ہے“

”جتنا تم کہتی اچھی ہو۔ تمہاری قسم جب تھک جاتی ہو۔ بہت

خوبصورت لگتی ہو۔“

”واقعی؟“

”تمہاری فتم۔“

”اچھا اب سو جاؤ میری جان! مجھے نیند آرہی ہے۔“

”اور جہنا یعنی ماما دین یعنی رمضان سو جاتی ہے۔ اور پیار لال

یعنی کریم چنید یعنی دھن راج نہایت خوش الحانی سے اقبال کا مصرعہ

گنگنہ نے لگتا ہے۔

انتہائے سادگی سے کھا گیا مزوور مات !
